فہرست

منظور الحسن

اولاد کی تربیت

ہمارے معاشرے میں اکثر والدین اپنی اولاد کی دینی اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے پریشان رہتے ہیں۔ جب بچے بلوغ کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو والدین کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے دین کی باتوں پر عمل کریں، باقاعدگی سے نماز پڑھیں، روزے رکھیں، قرآن کی تلاوت کریں۔ اسی طرح ان کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کی اولاد پاکیزہ عادتیں اپنائے، برے طور طریقوں سے گریز کرے اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سنجیدگی اختیار کرے۔ ان چیزوں کو اپنے بچوں میں پیدا کرنے کے لیے وہ بالعموم سختی اور زبردستی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ تربیت و اصلاح کا واحد راستہ جبر ہے۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ اصلاح کے اس طریقے کو اختیار کرنے کے بعد، بچوں کی مختلف طبیعتوں اور مختلف حالات کے لحاظ سے تین ہی طرح کے نتائج نکلتے ہیں۔

اس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض دھیمے مزاج والے بچے اپنی شخصیت کو ختم کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے عمل میں ان چیزوں کو اختیار کر لیتے ہیں جو نہ ان کے شعور کا حصہ بنی ہوتی ہیں اور نہ ان کے ذوق و شوق سے مطابقت رکھتی ہیں۔ وہ والدین کے حکم پر نماز، روزہ اور دوسرے دینی احکام پر باقاعدگی سے عمل کر رہے ہوتے ہیں، مگر ان اعمال کے پیچھے شعور اور ارادے کی کوئی قوت نہیں ہوتی۔ وہ چہرے پر ڈاڑھی بھی سجا لیتے ہیں اور خاص طرح کا لباس بھی پہن لیتے ہیں، مگر ان چیزوں کے لیے ان پر بے دلی اور بے رغبتی ہی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ اس صورت حال میں، ان کے اندر زندگی کا جوش و جذبہ اور کچھ کر گزرنے کی امنگ، کم و بیش ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض تیز مزاج والے بچے باغیانہ طرز عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ باتیں جنھیں ان

کے دل و دماغ نے قبول نہیں کیا ہوتا، وہ ان پر عمل پیرا ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ دین و اخلاق کی باتیں محض دقیانوسی تقریریں ہیں، ہم اپنی زندگی کو اس کے مطابق نہیں ڈھال سکتے۔ والدین کی طرف سے سختی کے جواب میں وہ ردعمل کی ایسی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ضد اور سرکشی کے رویے ان کی طبیعت کا حصہ بن جاتے ہیں اور وہ بعض اوقات ان باتوں کو بھی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں جنھیں ان کی عقل بالکل ٹھیک قرار دے رہی ہوتی ہے۔

اس کا تیسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض معتدل مزاج والے بچے منافقت کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ والدین کے سامنے ان کی مرضی کا اور ان کی عدم موجودگی میں اپنی مرضی کا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ والدین یہی سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ان کے بچے ایک خاص دینی اور اخلاقی زندگی گزار رہے ہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔

ان تینوں میں سے کوئی نتیجہ بھی مثبت اثرات کا حامل نہیں ہے۔ ان میں سے ہر نتیجہ بچوں کی تہذیب نفس میں رکاوٹ بننے کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی اور جسمانی صحت پر بھی منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔

اگر انصاف کی نگاہ سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ اس میں اولاد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اصل غلطی والدین کے تربیت کے طریقے میں پائی جاتی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس ساخت پر پیدا کیا ہے کہ پہلے وہ کسی بات کو اپنے ذہن و فکر اور شعور و ارادے کا حصہ بناتا ہے اور اس کے بعد اپنے عمل کو اس کے مطابق کرتا ہے۔ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے صرف جانور کے لیے رکھا ہے کہ اس کو جس طرف ہانکا جائے، وہ اسی طرف مڑ جائے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دو ہی راستوں سے کوئی بات قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ ایک عقل کے راستے سے اور دوسرے جذبات کے راستے سے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں نے ہمیشہ انسان کے ذہن کو مخاطب بنایا ہے اور اس کے در دل پر دستک دی ہے۔

والدین اگر اپنی اولاد کی صحیح معنوں میں تربیت کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے پرانے طریق کار کو یکسر بدل دیں۔ اس مقصد کے لیے انھیں چاہیے کہ وہ دینی و اخلاقی تربیت کے حوالے سے جو بات بھی اپنے بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، پہلے اسے ان کے شعور کا حصہ بنائیں۔ سختی، دھونس، دباؤ، زبردستی اور جبر کے تمام طریقے ترک کر دیں۔ ان کے علم کو اور ان کے فہم کو بہتر کریں۔ اور سقراط کی اس بات کو پلے باندھ لیں کہ صحیح علم ہی سے صحیح عمل تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس بات کا بھی اہتمام کریں کہ بچے اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اچھی صحبت میں گزاریں۔ وہ انھیں ایسا پاکیزہ ماحول فراہم کریں کہ بچے غیر محسوس طریقے سے پاکیزگی کو

اپناتے چلے جائیں۔اولاد کی تربیت واصلاح کا واحد راستہ یہی ہے۔اس کے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا،وہ گھر کی فضا میں گھٹن یا سرکشی یا منافقت کے سوا کوئی اور چیز پیدا نہیں کر سکے گا۔

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة المائدة

(۱)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ، اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ، غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ، اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴿۱﴾

ایمان والو، (اپنے پروردگار سے باندھے ہوئے سب) عہد و پیمان پورے کرو[۱]۔ تمھارے لیے مویشی کی قسم کے تمام چوپائے[۲] حلال ٹھیرائے گئے ہیں[۳]، سوائے اُن کے جو تمھیں بتائے جا رہے ہیں۔ لیکن احرام کی حالت میں شکار کو حلال نہ کر لو[۴]۔ (یہ اللہ کا حکم ہے اور) اللہ جو چاہتا ہے، حکم دیتا ہے[۵]۔ ۱

[۱] اِس سے مراد وہ عہد و پیمان ہیں جو ایمان و اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد ہر بندۂ مومن اپنے پروردگار سے اُس کی شریعت کی پابندی کے لیے باندھ لیتا ہے۔

[۲] اصل میں 'بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ 'اَنْعَامٌ' کا لفظ عربی زبان میں بھیڑ بکری، اونٹ اور گائے بیل کے لیے معروف ہے۔ اِس کی طرف 'بَهِيْمَةٌ' کی اضافت سے اِس میں انعام کی قسم کے وحشی چوپائے، یعنی ہرن وغیرہ بھی شامل ہو گئے ہیں۔

[۳] یعنی اُن کا حلال ہونا واضح کر دیا گیا ہے اور وہ تمام پابندیاں جو لوگوں نے اپنے اوہام کی بنا پر یا پچھلے صحیفوں کی کسی روایت کی بنا پر اپنے اوپر عائد کر رکھی تھیں، ختم ہو گئی ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ الۡحَرَامَ وَلَا الۡهَدۡىَ وَلَا الۡقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيۡنَ الۡبَيۡتَ الۡحَرَامَ يَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرِضۡوَانًا، وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا، وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ اَنۡ صَدُّوۡكُمۡ عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اَنۡ تَعۡتَدُوۡا، وَتَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡبِرِّ وَالتَّقۡوٰى، وَلَا تَعَاوَنُوۡا عَلَى الۡاِثۡمِ

ایمان والو، اللہ کے شعائر[6] کی بے حرمتی نہ کرو، نہ حرام مہینوں کی، نہ ہدی[7] کے جانوروں کی، نہ (اُن میں سے بالخصوص) اُن جانوروں کی جن کے گلے میں نذر کے پٹے بندھے ہوئے ہوں، اور نہ بیت الحرام کے عازمین کی جو اپنے پروردگار کی عنایتوں اور اُس کی خوشنودی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ہاں، جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو شکار کر سکتے ہو۔ تمھارے لیے مسجد حرام کا راستہ کچھ لوگوں نے بند کر دیا تھا تو (اُن کے اسلام قبول کر لینے کے بعد اب) اُن کے ساتھ اِس بنا پر تمھاری دشمنی بھی تمھیں ایسا

---

[۴] اصل الفاظ ہیں: 'غَيۡرَ مُحِلِّى الصَّيۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ'۔ مطلب یہ ہے کہ تمام چوپائے حلال ہیں، مگر اِس پابندی کے ساتھ کہ حالت احرام میں شکار کو جائز کر لینے والے نہ بن جانا۔ یہ بالکل اُسی نوعیت کا حکم ہے جو یہود کو سبت سے متعلق دیا گیا تھا۔

[۵] اِس طرح کے احکام ابتلا اور امتحان کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اِن میں بندوں کی مصلحت واضح نہیں ہوتی، اِس لیے جب تک یہ عقیدہ محکم نہ ہو کہ خدا حاکم مطلق ہے اور اُس کا کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، اُس وقت تک پوری وفاداری کے ساتھ کوئی شخص اُن کی تعمیل نہیں کر سکتا۔

[۶] یہ 'شعیرۃ' کی جمع ہے جس کے معنی علامت کے ہیں۔ اصطلاح میں اِس سے مراد وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور رسول کی طرف سے کسی حقیقت کا شعور قائم رکھنے کے لیے بطور ایک نشان کے مقرر کیے گئے ہوں، مثلاً حجر اسود، استلام اور رمی وغیرہ۔

[۷] یہ لفظ قربانی کے اُن جانوروں کے لیے آتا ہے جو ہدیے کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت الحرام لے جائے جاتے ہیں۔

وَالْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾

مشتعل نہ کر دے کہ تم حدود سے تجاوز کرو (نہیں، ہر حال میں حدود الٰہی کے پابند رہو[8]) اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو، مگر گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، اِس لیے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے[9]۔ ۲

[۸] مدعا یہ ہے کہ یہ اللہ کی حرمتیں ہیں، اِن کے توڑنے میں پہل ایک بدترین جرم ہے۔ اِس کا ارتکاب کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ بیت الحرام پر حملہ خدا کے گھر پر حملہ ہے، جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ہیں اور جو اللہ کے بندے اُس کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی تلاش میں رخت سفر باندھ کر نکلے ہیں، اُن کو نقصان پہنچانے کے درپے ہونا خود اللہ، پروردگار عالم سے تعرض کرنے کے مترادف ہے۔ اِس وجہ سے کسی قوم کی دشمنی بھی مسلمانوں کو اِس پر آمادہ نہ کرے کہ وہ اِس معاملے میں حدود سے تجاوز کریں۔ اُن پر واضح رہنا چاہیے کہ جو پروردگار اپنے عہد و میثاق سے قوموں پر کرم فرماتا اور اُنھیں سرفرازی بخشتا ہے، اُس کے ہاں اِس عہد و میثاق کے توڑنے کی پاداش بھی بڑی ہی سخت ہے۔

[۹] یہ ایک دوسرے پہلو سے اُسی بات کی تاکید ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...یعنی جس گروہ کو اللہ نے دنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، اُس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں سے مشتعل ہو کر خود اُسی طرح کی زیادتیاں کرنے لگے۔ وہ ایسا کرے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریروں نے برائی کی جو نیو جمائی، اُس پر اُس نے بھی چند ردّے رکھ دیے، حالاں کہ اُس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا۔'' (تدبر قرآن ۲/۴۵۵)

[باقی]

طالب محسن

دین خیر خواہی ہے

عَنْ تَمِیْمِ الدَّارِیِّ أَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ. قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ.

حضرت تمیم داری (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین خیر خواہی ہے۔ ہم نے پوچھا: کس کی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی، مسلمانوں کے لیڈروں کی اور ان کے عام آدمی کی۔

لغوی مباحث

'النَّصِیْحَۃُ': 'النَّصِیْحَۃُ' کا اشتقاق 'نَصَحَ یَنْصَحُ نُصْحًا' سے بھی ہو سکتا ہے اور 'نَصَحَ یَنْصَحُ نَصْحًا' سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی خلوص اور خیر خواہی کے ہیں اور دوسری صورت میں اس کا مطلب سینا ہے۔ مراد یہ کہ جس طرح سوئی اور دھاگا کاٹنے کے بجائے جوڑتا ہے، اسی طرح تم بھی جوڑنے والے بنو۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا امکان محض فن لغت کی حد تک ہے، اس فعل کے عام استعمالات کو سامنے رکھیں تو اس کے معنی خلوص اور خیر خواہی ہی کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس کے اس معنی کی بہت اچھی مثال سورۂ توبہ میں ہے۔ غزوۂ تبوک میں شرکت اور عدم شرکت کا مسئلہ اسلام کے ساتھ سچائی اور منافقت کا امتحان بنا ہوا تھا۔ اس پس منظر میں ان لوگوں کا مسئلہ بھی زیر بحث تھا جو شدید خواہش اور تمنا کے باوجود محض کسی بیماری، جسمانی کمزوری یا وسائل کی عدم دست یابی کے باعث

شرکت کرنے سے معذور تھے۔ سورۂ توبہ (۹:۱۹) میں فرمایا کہ ایسے لوگوں کی عدم شرکت میں حرج نہیں، بشرطیکہ یہ 'نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' (اللہ اور اس کے رسول کے خیر خواہ) ہوں۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ لفظ 'اَلنَّصِيْحَةُ' کے معنی کا اصل رخ خلوص کی طرف ہے۔ خیر خواہی چونکہ خلوص ہی کا عملی مظہر ہے، اس لیے یہ لفظ اس پہلو سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ روایت میں بھی چونکہ یہی پہلو مراد ہے، اس لیے ہم نے ترجمہ ''خیر خواہی'' کے لفظ ہی سے کیا ہے۔

'اَئِمَّةِ': 'اَئِمَّة'، 'امام' کی جمع ہے۔ امام کے معنی رہنما کے ہیں۔ یہ لفظ دینی اور سیاسی، دونوں رہنماؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس روایت کی شرح کرتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کون سا پہلو مراد ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مذہبی قائد ہی سیاسی قائد تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں حیثیتیں جمع تھیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو عامل بنایا، وہ بھی اور خلافت راشدہ میں خلفا بھی یہ دہری ذمہ داری ادا کرتے رہے۔ دینی رہنما یا عالم دین ایک الگ نوع کے طور پر بعد میں سامنے آئے ہیں۔ چنانچہ جس صورت حال میں یہ لفظ بولا گیا ہے، اس میں حکام و عمال ہی اس سے مراد ہیں، البتہ بعد کی صورت حال میں جب ہم اس ہدایت کا اطلاق کریں گے تو علما بھی اس میں شامل ہوں گے۔

معنی

اس روایت کے دو حصے ہیں: ایک حصہ 'اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ' کے مختصر جملے پر مشتمل ہے اور دوسرا 'لِمَنْ' کے جواب میں حضور کے ارشاد پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں جو بات کہی گئی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورے دین کو خیر خواہی قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ بات اپنے ظاہر ہی میں درست نہیں لگتی۔ چنانچہ شارحین نے اسے 'عِمَادُهُ' یا 'مُعْظَمُهُ'[1] کے معنی میں لے کر حل کیا ہے۔ یہ معنی لینے میں وہ ایک اور روایت دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: 'اَلْحَجُّ عَرَفَةُ' (حج عرفہ ہے)۔ ظاہر ہے، اس جملے کا مطلب یہی ہے کہ حج کا بنیادی، اہم ترین یا بڑا جز عرفہ ہے[2]۔ بے شک اس اسلوب کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں، لیکن یہ اسلوب ایک دوسرے پہلو کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ نماز ذکر ہے تو اس جملے سے نماز کی حقیقت واضح کرنا مقصود ہے۔

---

۱ یعنی دین کا ستون خیر خواہی ہے یا دین کا بڑا حصہ خیر خواہی ہے۔

۲ اس جملے کے صحیح معنی بھی اس ترجمے سے واضح نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ بھی حج کی اصل حقیقت کو سامنے رکھ کر بولا ہے۔

ہمارے نزدیک اس جملے میں بھی دینی وابستگیوں کی روح بیان کی گئی ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید اگلے سوال و جواب سے بالکل واضح طور پر ہوتی ہے۔ شارحین میں سے سب سے بہتر تعبیر نووی کی ہے، ان کے نزدیک دین کا عماد اور قوام نصیحت ہے، یعنی سچا دین دار اپنے کردار میں خیر خواہ ہوتا ہے۔

لغوی مباحث میں ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ 'اَلنَّصِيْحَةُ' کے معنی کیا ہیں۔ مادی اشیا کی نسبت سے 'نَصَحَ' کا فعل صاف اور خالص کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ جب یہ افراد کی نسبت سے استعمال ہوگا تو اس کے معنی خالص ہونے، یعنی خلوص کے ہوں گے۔ خلوص رویے کی صورت میں خیر خواہی بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ خیر خواہی قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی۔ کسی فرد کے ساتھ خیر خواہی اس وقت تک کوئی معنی نہیں رکھتی جب تک اس کے حقوق ادا نہ کیے جائیں۔ چنانچہ حقوق ادا کرنے، نقصان سے بچانے، فائدہ پہنچانے اور حمایت کرنے تک سارے امور خلوص و خیر خواہی کا حصہ ہیں۔

دوسرا حصہ 'لِمَنْ' کے سوال سے شروع ہوتا ہے۔ یہ سوال بڑا برمحل ہے۔ اگرچہ پہلے جملے میں بات جس طرح جامع اسلوب میں بیان کی گئی ہے، اس سے ہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ ایک مسلمان جہاں جہاں وابستہ ہوتا ہے، اسے اپنے ہر تعلق میں مخلص اور خیر خواہ ہونا چاہیے۔ اسی سے وہ حقیقی دین داری کو پا سکتا ہے، لیکن سوال اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب نے بات کو ہر اعتبار سے واضح کر دیا ہے۔ مزید براں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر خواہی کا اطلاق جن جن دائروں میں کیا ہے، اس سے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وابستگی خواہ دینی ہو اور خواہ انسانی، خیر خواہی کا تقاضا ہر دائرے میں ہے۔

ہم اوپر یہ عرض کر چکے ہیں کہ خلوص اور خیر خواہی کا سب سے پہلا اظہار حق ادا کرنا ہے۔ اس کے بعد توقیر و تعظیم، مدد و تحفظ، حمیت و حمایت اور ترقی و فروغ کے مراحل آتے ہیں۔ شارحین روایت نے اللہ تعالیٰ، کتاب، رسول، مسلم رہنماؤں اور عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کی جو تفصیل کی ہے، وہ درحقیقت یہی امور ہیں۔

شارحین لکھتے ہیں:

اللہ کی نسبت سے خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے، انھیں صحیح صفات سے متصف کیا جائے، ان کے حکم دینے کا حق تسلیم کیا جائے، ظاہر و باطن سے ان کے سامنے جھکا جائے، ان سے محبت کی جائے، ان کے ڈر کی وجہ سے گناہ نہ کیے جائیں اور ان کے مجرموں سے جہاد کیا جائے۔

کتاب کی نسبت سے خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے خدا کی جانب سے ہونے کی تصدیق کی جائے، اسے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ مانا جائے، اس کے معنی سمجھے جائیں، اسے دوسروں کو سکھایا جائے، اس کے اگلی نسلوں تک درست انتقال کا اہتمام کیا جائے، اس کے بارے میں شبہات دور کیے جائیں اور اس کے احکام و تعلیمات پر عمل کیا جائے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے، ان کے امر و نہی پر عمل کیا جائے، ان کی جان و مال سے مدد کی جائے، ان کی سنت کا احیا کیا جائے، ان پر درود پڑھا جائے، ان کے اخلاق عالیہ کی تقلید کی جائے اور ان سے اور ان کے اہل بیت سے محبت کی جائے۔

سیاسی رہنماؤں کی نسبت سے خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان کی حق میں اطاعت کی جائے اور حق میں ان کی مدد کی جائے، ان کو اللہ یاد دلایا جائے، ان معاملات سے انھیں آگاہ رکھا جائے جن سے ان کا آگاہ ہونا ضروری ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھی جائے، ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا جائے، ان کو زکوٰۃ ادا کی جائے، ان کی ذمہ داریوں میں ان کی مدد کی جائے اور انھیں ظلم کرنے سے بچایا جائے، جن معاملات میں وہ غفلت کا شکار ہیں، ان کی غفلت دور کی جائے۔

علما سے خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان سے علم سیکھا جائے اور ان کے بارے میں حسن ظن رکھا جائے۔

عام لوگوں کی نسبت سے خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ ان کی دین و دنیا میں بہتر رہنمائی کی جائے، دین و دنیا کے معاملات میں ان کی مدد کی جائے، ان کے جاہل کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے، ان کے بڑے کی توقیر اور ان کے چھوٹے پر رحم کیا جائے، ان کے افتراق و انتشار کو روکا جائے، ان سے حسد اور دھوکا نہ کیا جائے، ان کو فائدہ پہنچایا جائے، نقصان سے ان کی حفاظت کی جائے اور ان کے لیے وہی پسند کیا جائے جو اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔

شارحین کی یہ ساری تفصیل اس رویے کے کچھ نمایاں مظاہر ہیں جس کا عنوان خلوص و خیر خواہی ہے۔ فرد کی تبدیلی، حالات کے فرق، رجحانات کے اختلاف اور طبیعتوں کے تفاوت کی وجہ سے ان مظاہر کی کوئی مکمل فہرست بنانا ممکن نہیں ہے۔

لغوی مباحث میں ہم سورۂ توبہ کی آیت نقل کر چکے ہیں جس میں 'نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے حق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت کے تقاضے کئی پہلووں سے بیان ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اصل محرک خلوص اور خیر خواہی کو اس روایت میں بیان کر دیا ہے۔ جب تفصیل کے لیے سوال کیا گیا تو آپ نے ان چیزوں کو بیان کر دیا جن کے ساتھ وابستگی کے تقاضے قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان ہوئے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ایک نصیحت ہے، جس میں دین اور انسانوں کے ساتھ وابستگی کے اصل اصول کو بیان کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرتوں کا مطالعہ کریں تو ایک عملی حقیقت نظر آتا ہے۔ انھوں نے بندگی، خدا کے رسول اور خدا کی کتاب کے ساتھ وابستگی اور حکمرانوں اور خلق خدا کی خیر خواہی کے تقاضے جس طرح پورے کیے، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ نے دین کے اس پہلو کو خوب سمجھا اور پھر اس کے تقاضے بھی پورے کر کے دکھا دیے۔

متون

روایت کا پہلا جملہ تین چار طریقوں سے روایت ہوا ہے۔ بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار یہ جملہ فرمایا تھا۔ کچھ روایتوں میں یہ جملہ 'اِنَّ الدِّیْنَ النَّصِیْحَۃُ' کے الفاظ میں نقل ہوا ہے اور کچھ میں 'اِنَّمَا الدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ' کے الفاظ میں۔ ایک روایت میں اسی بات کو ادا کرنے کے لیے 'رَأْسُ الدِّیْنِ النَّصِیْحَۃُ' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ ایک روایت میں یہ بات بالکل ہی مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے: 'مَنْ لَّا یُصْبِحُ وَیُمْسِیْ نَاصِحًا لِلّٰہِ و ...فَلَیْسَ مِنْھُمْ'۔

سوال 'لِمَنْ' مسلم کی روایت میں صرف اسی لفظ تک محدود ہے، لیکن دوسرے متون یہی سوال: 'یَارَسُوْلَ اللّٰہِ لِمَنْ'، 'لِمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ' اور اسی طرح 'قَالُوْا' کے بجائے 'قُلْنَا'، 'قُلْتُ' اور 'قِیْلَ' کے صیغے بھی آئے ہیں۔

اکثر روایات میں پانچ چیزوں کا ذکر ہے، لیکن بعض روایات میں صرف پہلی تین ہی چیزوں کا ذکر ہے۔ ایک روایت میں ملائکہ کا اضافہ بھی ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۵۵؛ ابوداؤد، رقم ۴۹۴۴؛ نسائی، رقم ۴۱۹۷؛ ترمذی، رقم ۱۹۲۶؛ احمد، رقم ۳۲۸۱، ۷۹۴۱، ۱۶۹۸۲، ۱۶۹۸۳، ۱۶۹۸۴، ۱۶۹۸۷، ۱۶۹۸۸؛ ابن حبان، رقم ۴۵۷۴؛ دارمی، رقم ۲۷۵۴؛ بیہقی، رقم ۱۶۴۳۴۔

ساجد حمید

احرام میں مچھلی اور ٹڈی کا شکار

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلْجَرَادُ مِنْ صَیْدِ الْبَحْرِ.[1]

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹڈی صید البحر (بحری شکار کے حکم) میں ہے۔

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: أَصَبْنَا صِرْمًا مِنْ جَرَادٍ فَکَانَ رَجُلٌ مِنَّا یَضْرِبُ بِسَوْطِهِ وَهُوَ مُحْرِمٌ فَقِیْلَ لَهُ: إِنَّ هٰذَا لَا یَصْلُحُ فَذُکِرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّمَا هُوَ مِنْ صَیْدِ الْبَحْرِ.[2]

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ ہمیں ٹڈی کا ایک جھنڈ ملا۔ ہم میں سے ایک شخص انھیں کوڑے سے مارنے لگا، جبکہ وہ احرام باندھے ہوئے تھا۔ اسے لوگوں نے بتایا کہ احرام میں ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ اس بات کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا: وہ تو بس دریائی شکار کے حکم میں ہے۔[3]

ترجمے کے حواشی

ا۔ان روایتوں کا مطلب یہ ہے کہ اگر حاجی یا عمرہ کرنے والا حالت احرام میں ٹڈی کو پکڑے اور کاٹ کر کھا لے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے، کیونکہ ٹڈی کے شکار کا حکم وہی ہے جو دریائی جانور کے شکار کا حکم ہے۔قرآن مجید میں حالت احرام میں صید البحر (پانی کے جانوروں کا شکار) اور اس کے کھانے کو حلال کیا گیا ہے (المائدہ ۵:۹۶)۔ چنانچہ یہ روایتیں یہ کہہ رہی ہیں کہ خشکی کے ایک جانور ٹڈی کو پانی کے جانوروں کی طرح سمجھا جائے۔ یہ بات بظاہر درست نہیں لگتی کہ اللہ نے خشکی کے شکار کو حالت احرام میں حرام کیا ہے، جبکہ یہ روایتیں اسے حلال کر رہی ہیں۔ علما کے ایک گروہ نے انھیں ضعیف ہونے کی بنا پر بناے استدلال نہیں بنایا، لیکن ایک گروہ نے ان کی توجیہات کی ہیں، جن میں سے چند معروف درج ذیل ہیں:

ا۔ چونکہ ٹڈی اور مچھلی دونوں 'میتة' (مردار) کے حکم میں ایک ہیں، اس لیے صید کے حکم میں بھی مشترک ہوں گی۔ (مرقاۃ المفاتیح ۵/۵۹۷)

ب۔'اَلْجَرَادُ نَثْرَۃُ الْحُوْتِ'، ''ٹڈی مچھلی کی چھینک ہے'' (شرح الزرقانی ۲/۴۷۳)۔ یہ کیڑوں کی طرح مچھلی سے پیدا ہوتی ہے (مرقاۃ المفاتیح ۵/۵۹۷)۔اس لیے ان کا حکم بھی ایک جیسا ہوگا۔ یہ الفاظ کہ 'اَلْجَرَادُ نَثْرَۃُ الْحُوْتِ' (ٹڈی مچھلی کی چھینک ہے) سنن ابن ماجہ، رقم ۳۲۲۱ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان ہوئے ہیں، یہ روایت، ان شاء اللہ، ہم الگ سے زیر بحث لائیں گے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ زیر بحث کوئی ٹڈی اسی طرح پانی سے پیدا ہوتی ہو، جس طرح مچھر کا انڈا تمام مراحل پانی کے اندر گزارتا ہے۔ حالانکہ وہ خشکی کا جانور ہے، لیکن میری معلومات کی حد تک، جراد (locust) کے مراحل پیدایش اور نمو میں پانی کا دخل محض نمی کی حد تک ہی ہے۔اسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہے کہ وہ مچھلی کے جسم میں کہیں نمو پاتی ہے، اور چھینکنے سے باہر آ جاتی ہے۔

چھینکنے کا عمل اس جملے میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ بطور تشبیہ آیا ہے۔ بڑی مچھلیوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ پانی کو جب منہ سے نکالتی ہیں تو ایک تیز پھوار سی فضا میں پھیل جاتی ہے۔ٹڈی دل کے پھیلنے کی صورت بھی ایسی ہی ہے۔ اس صورت کی بنا پر یہ تشبیہ دی گئی ہے۔ٹڈی دل کے حملے کے وقت ایسے ہی لگتا ہے کہ جیسے ٹڈیاں زور سے دھکیلی گئی ہیں۔ جیسے ان کو ایک طرف سے چھینکا گیا ہو۔

ج۔ یہ دونوں تذکیہ کی محتاج نہیں ہیں، اس لیے دونوں کا حکم صید کے معاملے میں بھی ایک ہوگا (فیض القدیر

۳/۳۵۵)۔

د۔ جراد (ٹڈی) کی دو قسمیں ہیں: ایک برّی اور ایک بحری، دونوں کے لیے الگ الگ حکم ہو گا۔ بحری میں کفارہ نہیں ہے اور برّی میں کفارہ ہو گا۔ (مرقاۃ المفاتیح ۵/۵۹۷)

آخری رائے سب سے زیادہ محکم اور واضح نظر آتی ہے، لیکن اس موضوع کی تمام روایات جمع کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ روایتوں میں زیر بحث ٹڈی برّی ہے نہ کہ بحری۔ ہمارے خیال میں اصل سوال یہ ہے کہ برّی و بحری، دونوں طرح کے شکار میں کیا فرق ہے؟ کیا وجہ ہے کہ سمندری جانور مارنا حالت احرام میں جائز ہے اور خشکی کا جانور مارنا حرام۔ ظاہر ہے، دونوں طرح کے جانوروں میں زندگی موجود ہے، اس لیے کیا صید میں جانور کی جان لینا وجہ حرمت نہیں ہے؟ کیونکہ اگر جان لے لینا وجہ حرمت ہوتا تو سمندری شکار میں بھی تو جان لی جا رہی ہے، پھر وہ کیوں ناجائز نہیں ہے۔ اگر جان لینا ہی منع ہے تو پھر یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ ان دونوں کی جان لینے یا جان کی نوعیت میں کوئی جوہری فرق ہے، جس کی وجہ سے ایک حرام قرار دی گئی اور دوسری حلال، ایک فرق تو دم مسفوح ہے، وہ برّی جانوروں میں جان لیتے وقت بہتا ہے اور بحری میں نہیں اور یہی معاملہ ٹڈی کا ہے۔ اس کے حوت کے حکم کے تحت آنے کی شاید یہی وجہ ہو۔ بہرحال، یہ روایتیں ضعیف ہیں، ان سے کسی قسم کا حکم واجب نہیں ہوتا، اور ان کا ظاہر قرآن کی صریح نص کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں برّی اور بحری شکار کے لیے احکام ان الفاظ میں آئے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ. اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ.

''اے ایمان والو، حالت احرام میں شکار نہ مارو، اور تم میں سے جس نے اس حالت میں عمداً شکار کیا، تو اسے بدلے میں ویسا ہی جانور چوپایوں میں سے دینا ہو گا، جیسا اس نے مارا ہے، جس کے بارے میں (صحیح متبادل ہونے کا) فیصلہ دو معتبر قسم کے آدمی کریں گے، اور یہ ہدی کے طور پر کعبہ تک پہنچے گا یا کفارہ دینا ہو گا مسکینوں کا کھانا یا اس کے برابر روزے رکھنے ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کا وبال چکھے۔ جو ہو چکا اللہ نے اسے معاف کیا، لیکن اب جو کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا، اور اللہ سب سے طاقت ور اور انتقام والا ہے۔ تمھارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا حلال رکھا گیا

ہے۔تمھارے اور قافلوں کے زاد راہ کے لیے اور خشکی (المائدہ ۵: ۹۵-۹۶)
کا شکار، البتہ تمھارے لیے حرام ہے جب تک کہ تم
حالت احرام میں ہو اور اللہ سے ڈرو، جس کے پاس تم
سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت سنن ابی داؤد، رقم ۱۸۵۳ میں وارد ہوئی ہے، یہ اپنی سند میں ضعیف ہے۔ اس لیے اس سے حکم اخذ نہیں کیا جائے گا۔ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت درج ذیل مقامات پر بھی آئی ہے۔ سنن ابی داؤد، رقم ۱۸۵۵؛ سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۹۷۹۵۔

۲۔ یہ روایت سنن ابی داؤد، رقم ۱۸۵۴ ہے۔ یہ بھی ضعیف ہے، مگر مختلف مضمون کی ہے، اس لیے اسے یہاں نقل کرنا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ یہی واقعہ کچھ مختلف الفاظ میں یوں بھی آیا ہے: 'كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَجٍّ وَعُمْرَةٍ فَاسْتَقْبَلْنَا وَقَالَ عَفَّانُ فَاسْتَقْبَلَنَا رِجْلٌ مِنْ جَرَادٍ فَجَعَلْنَا نَضْرِبُهُنَّ بِعِصِيِّنَا وَسِيَاطِنَا وَنَقْتُلُهُنَّ وَأُسْقِطَ فِيْ أَيْدِيْنَا فَقُلْنَا: مَا نَصْنَعُ وَنَحْنُ مُحْرِمُوْنَ فَسَأَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: لَا بَأْسَ بِصَيْدِ الْبَحْرِ'۔ مسند احمد، رقم ۸۰۴۶، ۸۷۵۰، ۸۸۵۸، ۹۲۶۵؛ سنن ابن ماجہ، رقم ۳۲۲۲؛ سنن الترمذی، رقم ۸۵۰؛ سنن ابی داؤد، رقم ۱۸۵۳، ۱۸۵۴؛ سنن البیہقی الکبریٰ، رقم ۹۷۹۶۔ (ہم کسی حج و عمرہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ ہماری طرف ٹڈیاں اور عفان کے الفاظ میں ٹڈی دل ہماری طرف بڑھا، ہم انھیں لکڑیوں اور کوڑوں سے مارنے لگے، ہم انھیں مار رہے تھے اور وہ ہمارے ہاتھوں میں آ پڑیں تو یکایک ہمیں خیال ہوا کہ یہ ہم کیا کر رہے ہیں، ہم تو احرام میں ہیں، پھر ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: بحری شکار میں کچھ حرج نہیں ہے۔) مسند احمد کی یہ روایت رقم ۸۸۵۸ 'لَا بَأْسَ' کے الفاظ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں 'بِصَيْدِ الْبَحْرِ' کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ روایت قرآن کی تصریح کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ ان اصحاب نے خطا سے ٹڈیوں کو مارا تھا اور قرآن میں یہ بات واضح الفاظ میں موجود ہے کہ خطا پر کفارہ واجب نہ ہوگا، مذکورہ بالا آیت کے یہ الفاظ اسی پر دلالت کر رہے ہیں کہ 'وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا' (اور تم میں سے جس نے عمدًا

شکار مارا)، ان الفاظ سے واضح ہے کہ خطا سے ایسا کرنے والے کے بارے میں کفارے کا حکم نہیں ہے، اس لیے یہ بات درست ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی کفارہ عائد نہیں ہوا۔

محمد عمار خان ناصر

سزا کے نفاذ اور اطلاق کے اصول

[یہ مصنف کی زیر طبع کتاب ''حدود و تعزیرات ـــــ چند اہم مباحث'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث کو بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔]

ـــــ ۲ ـــــ

''شرعی سزاؤں کی ابدیت اور آفاقیت کی بحث'' کے زیر عنوان ہم نے یہ بات واضح کی ہے کہ قرآن و سنت میں جن جرائم کی متعین سزائیں مقرر کی گئی ہیں، وہ ابدی ہیں اور اصولی طور پر ان سے مختلف اور متبادل سزائیں تجویز کرنے کی شرعاً کوئی گنجایش نہیں۔ یہاں ہم شرعی سزاؤں کے نفاذ اور اطلاق کے حوالے سے اس تصور کے مضمرات اور بعض دیگر عملی پہلوؤں کی وضاحت کریں گے۔

'حق اللہ' اور 'حق العبد' کا فرق

مذکورہ بحث میں ہم نے اپنے نقطۂ نظر کو ان سزاؤں کے 'حق اللہ' ہونے پر مبنی قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اصلاً اپنے حق کے طور پر بیان کیا اور ان کے نفاذ کو اسی حیثیت سے اہل ایمان کی ذمہ داری ٹھہرایا ہے۔ ہم نے روایات کی روشنی میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ اگر ان جرائم سے متعلق کوئی مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا جائے اور سزا کے نفاذ کی شرائط پوری اور موانع مفقود ہوں تو قاضی کو مجرم پر ترس کھا کر یا خود صاحب حق کی طرف سے معافی کی بنیاد پر سزا معاف کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس سے صرف وہی صورت مستثنیٰ ہوگی جہاں خود شارع

نے مخصوص حکمت کے تحت صاحب حق کو سزا معاف کر دینے کا اختیار دیا ہو، جیسا کہ مثال کے طور پر قصاص کو معاف کرنے کا اختیار اولیاے مقتول کو دیا گیا ہے۔ جن سزاؤں کے بارے میں خود نص میں یہ صراحت موجود نہیں، ان کی معافی کا اختیار کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ فقہاے شوافع نے حد قذف کو، جبکہ فقہاے احناف نے حد سرقہ کو 'حق العبد' قرار دیتے ہوئے یہ راے اختیار کی ہے کہ صاحب حق کی طرف سے معافی کی صورت میں مجرم سے یہ سزائیں ساقط ہو جائیں گی، تاہم جیسا کہ ہم نے واضح کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہونے کے پہلو سے تمام شرعی سزائیں 'حق اللہ' ہیں اور ان کا 'حق اللہ' ہونا اسی کا تقاضا کرتا ہے کہ مقدمہ عدالت میں پیش ہو جانے کے بعد معافی کے حوالے سے متاثرہ فریق کا اختیار ختم ہو جائے اور جرم ثابت ہونے کی صورت میں سزا کا نفاذ لازم قرار پائے۔

البتہ 'حق اللہ' اور 'حق العبد' کی تقسیم کسی جرم کے قابل دست اندازی پولیس ہونے یا نہ ہونے کے پہلو سے درست، بلکہ قانون کے نفاذ اور اطلاق کے پہلو سے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر زنا بالرضا میں کسی انسان کے حق پر تعدی نہیں پائی جاتی اور اس میں کسی دوسرے فرد یا معاشرے کو متاثرہ فریق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اصلاً گناہ ہے اور اس کے ارتکاب پر ریاست کو از خود نہیں، بلکہ کسی کی طرف سے شریعت کی بیان کردہ کڑی شرائط کے مطابق شکایت کا اندراج کرائے جانے کے بعد ہی کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ زنا کے علاوہ حدود سے متعلق باقی تمام جرائم میں دوسرے انسان متاثرہ فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض، مثلاً قتل، چوری، قذف اور زنا بالجبر ایسے ہیں جن میں تعدی اصلاً کسی فرد تک محدود ہوتی ہے، جبکہ بعض، مثلاً ڈکیتی، اجتماعی آبروریزی اور حرابہ کی دیگر صورتیں، ایسے ہیں جن کی زد میں معاشرہ اور اس کا نظم اجتماعی بھی آتا ہے۔ پہلی نوعیت کے جرائم میں مجرم کے خلاف عدالتی کارروائی شروع کرنے کا حق اصلاً اس فرد یا اس کے ساتھ قریبی تعلق اور ہمدردی رکھنے والے کسی شخص کو، جبکہ دوسری نوعیت کے جرائم میں مقدمہ چلانے کا اختیار نظم اجتماعی کو حاصل ہونا چاہیے۔ ہماری راے میں پیشہ ورانہ بدکاری کو بھی معاشرے کے خلاف جرم شمار کرتے ہوئے اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کو نظم اجتماعی کا اختیار، بلکہ اس کی ذمہ داری قرار دیا جانا چاہیے۔

یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ ہم نے قتل، چوری، قذف اور زنا بالجبر کو مطلقاً نہیں، بلکہ ''اصلاً'' فرد کے خلاف تعدی کے زمرے میں شمار کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر جرم کے اثرات اور مجرم اور متاثرہ فریق کے احوال و اوصاف تقاضا کریں تو ان جرائم کو فرد کے بجاے معاشرے کے خلاف تعدی کی فہرست میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں جزئی قانونی صورتوں کی کوئی حتمی اور بے لچک تقسیم نہ ممکن ہے اور نہ ضروری۔ چنانچہ اسے کسی اصولی بحث کا

موضوع بنانے کے بجاے قانون کے اطلاقی ماہرین اور عدالت کی صواب دید پر چھوڑ دینا چاہیے۔

حدود میں معافی یا تخفیف کی گنجایش

اوپر ہم نے شرعی سزاؤں کی حیثیت واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اگر ان جرائم سے متعلق کوئی مقدمہ عدالت میں پیش کر دیا جائے اور سزا کے نفاذ کی شرائط پوری اور موانع مفقود ہوں تو قاضی کو مجرم پر ترس کھا کر یا خود صاحب حق کی طرف سے معافی کی بنیاد پر سزا معاف کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔'' یہاں ''شرائط پوری اور موانع مفقود'' ہونے کی قید بے حد اہم اور قابل توجہ ہے اور اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں کے اپنی اصولی حیثیت میں نا قابل تبدیل یا نا قابل معافی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سزاؤں کے نفاذ کا معاملہ ہر اعتبار سے عام اور مطلق ہے اور ان میں علمی و عقلی تخصیص وتقیید کا کوئی امکان یا عملی حالات کے لحاظ سے لچک کی کوئی گنجایش نہیں پائی جاتی۔ قرآن مجید کے ہر طالب علم پر یہ بات واضح ہے کہ وہ بالعموم کسی بھی معاملے کی جزوی اور اطلاقی تفصیلات سے تعرض کرنے کے بجاے محض اصولی نوعیت کا ایک حکم دینے پر اکتفا کرتا ہے، جبکہ اس حکم کے اطلاق اور نفاذ یا دوسرے لفظوں میں اس کی بنیاد پر عملی قانون سازی کے لیے دیگر عقلی و اخلاقی اصولوں اور عملی مصالح کی روشنی میں بہت سی قیود و شرائط کا اضافہ اور مختلف صورتوں میں حکم کے اطلاق و نفاذ کی نوعیت میں فرق کرنا پڑتا ہے۔

حکم کے اطلاق کا یہ اصول قرآن مجید نے خود واضح کیا ہے۔ چنانچہ جو مسلمان غیر مسلموں کے علاقے میں ان کے ظلم و جبر کا شکار ہوں، ان کی مدد کو مسلمانوں کا فرض قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کا صلح کا معاہدہ ہو تو پھر اس قوم کے خلاف مظلوم مسلمانوں کی مدد نہیں کی جا سکتی[1]۔ اسی طرح جب مشرکین عرب کو ایمان نہ لانے کی صورت میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو یہ واضح کیا گیا کہ جن مشرک قبائل کے ساتھ مخصوص مدت تک صلح کے معاہدے کیے گئے ہیں، مدت پوری ہونے سے پہلے ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا[2]۔

اس اصول کی روشنی میں دیکھیے تو شریعت کے دیگر تمام احکام کی طرح سزاؤں کے نفاذ میں بھی ان تمام شروط و قیود، مصالح اور موانع کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو جرم و سزا کے باب میں عقل عام پر مبنی اخلاقیات قانون اور خود

---

۱ الانفال ۸: ۷۲۔

۲ التوبہ ۹: ۴۔

شریعت کی ہدایات سے ثابت ہیں۔ ہمارے ہاں حدود کے بارے میں یہ بات بالعموم کہی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو قرآن وسنت میں مقرر کردہ سزاؤں میں تخفیف یا معافی کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہ بات، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، اس مفہوم میں درست ہے کہ اصولی طور پر شریعت کی طے کردہ سزاؤں سے مختلف یا ان سے کم یا زیادہ سزا مقرر نہیں کی جا سکتی، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ زنا کی سزا ۱۰۰ کے بجاے ۸۰ یا ۱۲۰ کوڑوں یا قید یا جرمانے کی صورت میں مقرر کر دی جائے۔ اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ زنا اور چوری کی اصل سزا سو کوڑے اور ہاتھ کاٹنا ہے اور عمومی طور پر یہی سزا قابل نفاذ ہوگی، یعنی اگر کسی شخص سے لفظ کے عام اور متعارف مفہوم کے لحاظ سے چوری یا زنا کا فعل سرزد ہو جائے اور عقل عام اور اخلاقیات قانون اس کو جرم قرار دینے یا اس پر سزا کے نفاذ میں مانع نہ ہوں تو ایسے شخص پر قرآن مجید کی بیان کردہ سزائیں ہی نافذ کی جائیں گی۔ تاہم کسی مخصوص مجرم پر سزا کے اطلاق کا معاملہ بالکل بے لچک نہیں ہے، بلکہ جرم کی نوعیت اور مجرم کے حالات کے لحاظ سے اس میں تخفیف ہو سکتی ہے اور معقول اسباب ووجوہ کسی رعایت کا تقاضا کریں تو مخصوص حالات میں مجرم کو سزا سے مستثنیٰ بھی کیا جا سکتا ہے۔ سزا کے نفاذ کا یہ اصول ایک عمومی نوعیت کا اخلاقی اصول ہے اور اس کا اطلاق جیسے عام سزاؤں پر ہوتا ہے، اسی طرح شرعاً مقرر کردہ سزاؤں، یعنی 'حدود' پر بھی ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا کہ کسی مجرم پر 'حد' نافذ کرتے ہوئے مخصوص اسباب واحوال کے پیش نظر سزا میں تخفیف یا معافی کی کوئی گنجایش نہیں ہے، شریعت کی منشا کی درست ترجمانی نہیں کرتا اور عہد نبوی اور عہد صحابہ وتابعین کے نظائر سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی۔

ذیل میں ہم چند ایسے اہم پہلوؤں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کریں گے جو کسی بھی نوعیت کی سزا کی معافی یا اس میں تخفیف کا موجب بن سکتے ہیں۔

۱۔ اگر شریعت کا کوئی دوسرا اصول کسی مخصوص مجرم پر سزا کے نفاذ میں مانع ہو تو اسے سزا سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا یا اس کے لیے متبادل سزا تجویز کی جائے گی:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب بنو حنیفہ کے مدعی نبوت مسیلمہ کے دو قاصد اس کا خط لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ مسیلمہ کی نبوت پر ایمان رکھتے ہیں؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ 'لَوْ لَا اَنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ لَضَرَبْتُ اَعْنَاقَکُمَا'[۳۳]، یعنی اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کی روایت نہ ہوتی تو میں تم دونوں کی گردن مار دیتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ

۳۳؎ ابوداؤد، رقم ۲۳۸۰۔

اگر چہ ارتداد کی وجہ سے وہ دونوں قاصد قتل کے مستحق ہو چکے تھے، لیکن قاصدوں اور سفیروں کے احترام اور ان کی حفاظت کا ایک دوسرا اخلاقی اصول اس پر عمل کرنے میں مانع تھا اور آپ نے اسی کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں بحفاظت واپس جانے دیا۔ آپ نے اسی اصول پر یہ ہدایت کی کہ اگر باپ اپنے بیٹے کو قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل نہ کیا جائے[4]۔ ایک شخص نے اپنے غلام کو قتل کر دیا تو آپ نے اسے قصاص میں قتل کرنے کے بجاے سو کوڑے لگوائے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا[5]۔ گویا آپ نے باپ اور بیٹے کے مابین پائے جانے والے فرق مراتب اور مالک کو اپنے مملوک پر حاصل حق ملکیت کو قصاص کے استیفا سے مانع تصور کیا ہے۔

۲۔ سزا نافذ کرتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا مجرم کو سزا دینے سے کسی بے گناہ کو تو کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا اور یہ کہ مجرم اپنی جسمانی حالت کے لحاظ سے سزا کا تحمل بھی کر سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدکاری کی مرتکب ایک حاملہ عورت کو اس وقت تک رجم نہیں کیا، جب تک وہ بچے کی ولادت سے فارغ نہیں ہو گئی[6]۔ اسی طرح جب سیدنا علی نے ایک لونڈی پر زنا کی سزا نافذ کرنے سے اس لیے گریز کیا کہ وہ بچے کی ولادت کے بعد ابھی حالت نفاس میں تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کی تحسین کی[7]۔ آپ نے ایک بوڑھے کو، جو کوڑوں کی سزا کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، حقیقی طور پر سو کوڑے لگوانے کے بجاے یہ حکم دیا کہ کھجور کے درخت کی ایک ٹہنی لے کر جس میں سو پتلی شاخیں ہوں، ایک ہی دفعہ اس کے جسم پر مار دی جائے[8]۔ سیدنا عمر کے پاس ایک شخص لایا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں چوری کے جرم میں پہلے ہی کاٹا جا چکا تھا۔ سیدنا عمر نے اس کا دوسرا پاؤں کاٹنے کا حکم دیا تو سیدنا علی نے کہا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اس کے پاس چلنے کے لیے ایک پاؤں اور اپنی ضروریات کے لیے ایک ہاتھ رہنا چاہیے۔

۳۔ کسی مخصوص صورت حال میں سزا کے نفاذ سے کوئی مفسدہ پیدا ہونے کا خدشہ ہو تو بھی شارع کی منشا یہی ہوگی کہ سزا نافذ نہ کی جائے، چنانچہ جنگ کے لیے نکلنے والے لشکر میں سے کوئی شخص اگر چوری کرے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا[9]۔ انصار کے قبیلہ خزرج کے سردار عبد اللہ بن ابی نے آپ کی ذات کے بارے

---

[4] ترمذی، رقم ۱۳۲۰۔ ابن ماجہ، رقم ۲۶۵۲۔

[5] ابن ماجہ، رقم ۲۶۵۴۔

[6] مسلم، رقم ۳۲۰۷۔

[7] مسلم، رقم ۳۲۱۷۔

[8] ابوداؤد، رقم ۳۸۷۸۔ ابن ماجہ، رقم ۲۵۶۴۔

میں گستاخی کرنے، آپ کے اہل بیت کے بارے میں نہایت اذیت ناک پروپیگنڈا کرنے اور مسلمانوں کے مابین تفریق وانتشار پیدا کرنے کا رویہ اختیار کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس مصلحت کے تحت اس سے درگذر فرمایا کہ وہ انصار کے ایک گروہ کا سردار تھا اور اس کو قتل کرنے سے اس گروہ میں منفی جذبات پیدا ہونے کا شدید خدشہ موجود تھا۔[10] ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ اس سے صرف نظر کرو، کہیں لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔[11]

۴۔ جرم کی نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات کی رعایت کرنا اور اگر وہ کسی پہلو سے معاف کیے جانے کا مستحق ہو تو اسے معاف کر دینا بھی اسی اصول کی ایک فرع ہے۔ چنانچہ کسی بھی مجرم پر سزا کا نفاذ اسی صورت میں قرین انصاف ہے جب وہ کسی پہلو سے رعایت کا مستحق نہ ہو۔ اگر جرم کی نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات کسی رعایت کا تقاضا کر رہے ہوں تو اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے سزا کو نافذ کرنا عدل وانصاف اور خود شارع کی منشا کے خلاف ہے۔ عہد نبوی میں اس کی ایک عمدہ مثال حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے واقعے میں ملتی ہے۔ حاطب ایک بدری صحابی تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر انھوں نے ایک خاتون کے ذریعے سے اہل مکہ کو خفیہ پیغام بھیج کر انھیں اس حملے سے پیشگی آگاہ کرنے کی کوشش کی جس کی تیاریاں مدینہ منورہ میں جاری تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعۂ وحی اس سے آگاہ کیا گیا تو آپ نے اس خاتون کو گرفتار کرنے کے بعد حاطب کو اپنے پاس طلب کیا۔ حاطب نے ایک نہایت اہم جنگی راز فاش کرنے کی کوشش کر کے بظاہر بغاوت جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا جس کی سزا قتل بھی ہو سکتی تھی اور سیدنا عمر نے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاطب کو یہی سزا دینے کی اجازت مانگی تھی، تاہم آپ نے حاطب کو وضاحت پیش کرنے کا موقع دیا اور انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ایسا بدخواہی کی نیت سے نہیں، بلکہ محض قریش پر احسان کرنے کی غرض سے کیا ہے تاکہ اس کے عوض میں وہ مکہ میں موجود حاطب کے اعزہ واقربا اور اموال و املاک کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتے رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب کی اس وضاحت کو قبول کر لیا اور انھیں کوئی سزا نہیں دی گئی۔[12]

۹؎ ترمذی، رقم ۱۳۷۰۔

۱۰؎ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۱۵۸/۴۔

۱۱؎ بخاری، رقم ۳۲۵۷۔

۱۲؎ بخاری، رقم ۲۷۸۵۔

۵۔ اگر مجرم کسی فعل کی حرمت سے ناواقف ہو تو یہ چیز سرے سے سزا کے سقوط یا اس میں تخفیف کا سبب بن سکتی ہے۔ سعید ابن المسیب روایت کرتے ہیں کہ شام میں ایک شخص نے کسی جھجک کے بغیر لوگوں کے سامنے اپنے زنا کرنے کا ذکر کیا۔ لوگوں کی طرف سے ناگواری کے اظہار پر اس نے تعجب سے کہا کہ اچھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کہا ہے! میں تو اس بات سے واقف نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عامل کو لکھا کہ اگر یہ شخص زنا کی حرمت سے واقف تھا تو اس پر حد قائم کرو، ورنہ اسے بتاؤ کہ یہ حرام ہے اور اگر دوبارہ اس کا مرتکب ہو تو پھر حد جاری کرو۔[13] عبدالرحمٰن بن حاطب کی ایک شوہر دیدہ لونڈی، جو آزاد ہو چکی تھی، حاملہ ہو گئی تو اسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے بے تکلف انداز میں بتایا کہ ہاں، میں نے مرغوش نامی شخص سے دو درہم لے کر زنا کیا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے سزا دینا چاہی تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ جس انداز میں بے جھجک زنا کا ذکر کر رہی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اس کی حرمت اور شناعت سے واقف نہیں، جبکہ حد اسی شخص پر نافذ کی جا سکتی ہے جو اس فعل کی حرمت سے واقف ہو۔ چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کے بجاے سو کوڑے لگانے اور ایک سال کے لیے جلاوطن کر دینے پر اکتفا کی۔[14] امام جعفر صادق نے ایک مقدمے میں یہ فتویٰ دیا کہ اگر چور اس بات سے واقف نہیں تھا کہ چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو بھی اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔[15]

۶۔ حرمت محل میں واقع ہونے والے اشتباہ کی بنا پر سزا میں تخفیف کے نظائر بھی روایات و آثار میں موجود ہیں۔ چنانچہ ایک سریے میں صحابہ نے کچھ لوگوں کو اسلام قبول کرنے کے باوجود قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولوں کے لیے نصف دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔[16] اصولی طور پر ان مقتولوں کا قصاص لیا جانا چاہیے تھا یا کم از کم ان کی پوری دیت ادا کی جانی چاہیے تھی، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص صورت حال کے تناظر میں قاتلین سے قصاص بھی نہیں لیا اور انھیں آدھی دیت بھی معاف کر دی۔

زنا کے مقدمات میں اس اصول کے اطلاق کی مثال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمے میں، جس میں شوہر نے اپنی بیوی کی لونڈی سے جماع کیا تھا، یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر تو خاوند نے بیوی کی اجازت کے بغیر ایسا کیا ہے تو اسے رجم کیا جائے گا، لیکن اگر اس میں بیوی کی رضامندی شامل تھی تو خاوند کو صرف سو کوڑے لگائے جائیں

۱۳؎ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۳۷۱۴۔

۱۴؎ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۸۴۲۔

۱۵؎ الطوسی، تہذیب الاحکام ۱۰/۱۲۱۔

۱۶؎ ترمذی، رقم ۱۵۳۰۔

گے۔[17] اسی نوعیت کے ایک دوسرے مقدمے میں آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر شوہر نے لونڈی کے ساتھ زبردستی جماع کیا ہے تو لونڈی آزاد ہے، لیکن اگر لونڈی رضامند تھی تو پھر وہ شوہر کی ملکیت قرار پائے گی اور دونوں صورتوں میں شوہر کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کو اس جیسی کوئی دوسری لونڈی خرید کر دے۔[18]

سیدنا عمر اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو جس نے اپنی بیوی کی لونڈی سے زبردستی زنا کیا تھا، رجم نہیں کیا، بلکہ اسے سو سے کم کوڑے لگانے کی سزا دی۔[19] اس صورت میں سو کوڑے لگانے یا رجم کرنے کے بجاے تعزیری سزا دینے کا فتویٰ سفیان ثوری سے بھی مروی ہے۔[20] سعید بن المسیب اور مدینہ کے بعض دیگر فقہا کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اور کسی دوسرے شخص کی مشترکہ لونڈی سے وطی کرے تو اسے ننانوے کوڑے لگائے جائیں۔[21] ابن المسیب نے ایک مقدمے میں جس میں دو مالکوں نے اپنی مشترکہ لونڈی سے مجامعت کی تھی، فتویٰ دیا کہ دونوں کو پچاس پچاس کوڑے لگائے جائیں۔[22] ابن المسیب ہی کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر کوئی شخص مال غنیمت کے تقسیم ہونے سے پہلے ہی کسی لونڈی سے استمتاع کر لے تو اسے ننانوے کوڑے لگائے جائیں گے۔[23] ایک عورت نے اپنے غلام سے نکاح کر لیا اور اس کے جواز پر یہ استدلال پیش کیا کہ قرآن مجید میں 'ما ملکت ایمانکم' کو حلال کہا گیا ہے اور میرا غلام بھی میری ملک یمین ہے۔ سیدنا علی کے مشورے پر سیدنا عمر نے اسے محض سو کوڑوں کی سزا دی۔ اسی طرح ایک خاتون نے گواہوں اور سرپرست کے بغیر نکاح کر لیا اور کہا کہ میں ثیب ہوں اور اپنے معاملے میں خود مختار ہوں۔ سیدنا عمر نے اسے بھی صرف سو کوڑے لگائے۔[24]

۷۔ جن حالات میں جرم کا ارتکاب کیا گیا، اگر وہ سزا میں تخفیف کے متقاضی ہوں تو بھی سزا معاف کی جا سکتی یا کم تر سزا دی جا سکتی ہے:

۱۷؎ ترمذی، رقم ۱۳۷۱۔ نسائی، رقم ۳۳۷۰۔

۱۸؎ نسائی، رقم ۳۳۱۰۔ ابوداؤد، رقم ۳۸۶۸۔

۱۹؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۵۳۶، ۱۳۴۹۱۔

۲۰؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۵۳۳۔

۲۱؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۵۲۶۔

۲۲؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۵۲۸۔

۲۳؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۵۳۷۔

۲۴؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۷۶۰۔

عباد بن شرحبیل بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے قحط کے زمانے میں مدینہ کے ایک باغ میں داخل ہو کر اس کا کچھ پھل کھایا اور کچھ کپڑے میں ڈال لیا۔ اتنے میں باغ کا مالک آ گیا اور اس نے پکڑ کر ان کی پٹائی بھی کی اور ان کے کپڑے بھی چھین لیے۔ عباد شکایت لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے تو آپ نے باغ کے مالک سے فرمایا کہ تم نے نہ تو اسے سکھایا، حالانکہ یہ ناواقف تھا اور نہ اسے کھلایا، حالانکہ یہ بھوکا تھا۔ پھر آپ کے کہنے پر باغ کے مالک نے عباد کے کپڑے بھی واپس کر دیے اور انھیں کچھ غلہ بھی دے دیا۔[۲۵]

ابولولو مجوسی نے سیدنا عمر کو شہید کر دیا تو ان کے بیٹے عبید اللہ نے جوش انتقام سے مغلوب ہو کر قتل کی سازش میں شریک ہونے کے شبہے میں فارس کے نومسلم جرنیل ہرمزان، ایک نصرانی جفینہ اور ابولولو کی بیٹی کو قتل کر دیا۔ ان میں سے ہرمزان اور ابولولو کی بیٹی پہلے سے اسلام قبول کر چکے تھے۔ اس موقع پر سیدنا عثمان نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا کہ عبید اللہ کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض صحابہ نے کہا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ کل عبید اللہ کے والد قتل ہوئے ہیں اور آج اسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ سیدنا عمر کی شہادت اور اس مخصوص جذباتی کیفیت کی رعایت کرتے ہوئے جس میں عبید اللہ نے تہرے قتل کا ارتکاب کیا تھا، اس سے قصاص نہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔[۲۶]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت کا مقدمہ پیش کیا گیا جس نے زنا کا ارتکاب کیا تھا۔ اس سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک سفر کے دوران میں اس نے ایک چرواہے سے پینے کے لیے پانی مانگا تو اس نے اس شرط پر پانی دینے پر رضامندی ظاہر کی کہ خاتون اسے اپنے ساتھ زنا کرنے کی اجازت دے۔ چنانچہ خاتون نے شدید پیاس سے مجبور ہو کر اس کی شرط پوری کر کے اس سے پانی حاصل کیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس ضمن میں صحابہ سے مشورہ کیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس نے حالت اضطرار میں ایسا کیا ہے۔ چنانچہ اس خاتون کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔[۲۷]

ایک دوسرے موقع پر ایک خاتون زنا ہی کے جرم میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائی گئی اور اس نے بتایا کہ وہ نادار اور محتاج ہے اور لوگ اس پر ترس کھا کر اس کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، چنانچہ وہ جسم فروشی کر کے کچھ نہ کچھ پیسے جمع کر لیتی ہے۔ یہ خاتون محصنہ ہونے کی بنا پر 'رجم' کی سزا کی مستحق تھی، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس

---

۲۵ ابو داؤد، رقم ۲۲۵۲۔

۲۶ طبری، تاریخ الامم والملوک ۲/ ۵۸۶-۵۸۷۔

۲۷ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۸۲۷۔

کے حالات کے پیش نظر اسے سو کوڑوں کی سزا دینے پر اکتفا کی۔[28]

سیدنا عمر کے سامنے کچھ غلاموں کو پیش کیا گیا جنھوں نے ایک شخص کی اونٹنی چرا کر اسے ذبح کر لیا تھا۔ سیدنا عمر نے پہلے تو ان کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، لیکن پھر ان کے مالک سے کہا کہ مجھے لگتا ہے کہ تم انھیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں دیتے۔ چنانچہ انھوں نے غلاموں کو سزا دینے کے بجاے ان کے مالک پر تاوان کے طور پر لازم کیا کہ وہ اونٹنی کے مالک کو اس کی قیمت کے دوگنا رقم ادا کرے۔[29] اسی اصول کے تحت سیدنا عمر اور سیدنا علی قحط سالی کے زمانے میں چور پر قطع ید کی سزا نافذ نہیں کیا کرتے تھے۔[30]

۸۔ سزا تجویز کرتے وقت مجرم کے تمدنی پس منظر، اس کے ماحول اور صالح معاشرتی تربیت کے لیے اس کو میسر مواقع کا لحاظ کرنا بھی ناگزیر ہوگا۔ اس ضمن میں لونڈیوں کے لیے زنا کی آدھی سزا تجویز کرنے کا قرآنی حکم بطور خاص قابل توجہ ہے۔[31] فقہا اس تخفیف کی توجیہ بالعموم غلاموں اور لونڈیوں کی فروتر معاشرتی اور قانونی حیثیت کے تناظر میں کرتے ہیں۔ ان کے زاویۂ نگاہ سے چونکہ غلاموں اور لونڈیوں کے معاشرتی و قانونی حقوق معاشرے کے آزاد افراد کے مقابلے میں کم تر ہیں، اس وجہ سے ان پر ذمہ داریاں بھی کم عائد کی گئی ہیں اور جرم کے ارتکاب کی صورت میں تخفیف شدہ سزا اسی کی ایک فرع ہے۔[32] شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ چونکہ غلاموں اور لونڈیوں پر سزا نافذ کرنے کا اختیار ان کے مالکوں ہی کو دے دیا گیا تھا اور ان کی طرف سے اس اختیار کے استعمال میں زیادتی اور حدود سے تجاوز کا خدشہ موجود تھا، اس لیے مملوکوں کی سزا میں تخفیف کر دی گئی تاکہ انھیں امکانی حد تک مالکوں کی تعدی سے بچایا جا سکے۔[33] تاہم بعض معاصر اہل علم نے اس تخفیف کی توجیہ یہ کی ہے کہ غلام اور لونڈیاں، چونکہ خاندان کی حفاظت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مناسب اخلاقی تربیت سے محروم تھیں اور انھیں اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے نکاح کا حق بھی آزاد لوگوں کی طرح حاصل نہیں تھا، اس لیے زنا میں ملوث ہونے کی صورت میں ان کے اس معاشرتی پس منظر کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے لیے کم تر سزا تجویز کی گئی۔[34]

۲۸؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۳۶۴۹، ۱۳۶۵۰۔

۲۹؎ موطا امام مالک، رقم ۲۳۳۰۔

۳۰؎ مصنف عبد الرزاق، رقم ۱۸۹۹۰، ۱۸۹۹۱۔ ابن القیم، اعلام الموقعین ۶۰۵۔ الطّوسی، تہذیب الاحکام ۱۰/ ۱۱۳۔

۳۱؎ النساء ۴: ۲۵۔

۳۲؎ کاسانی، بدائع الصنائع ۷/ ۵۷۔

۳۳؎ حجۃ اللہ البالغہ ۲/ ۴۲۵۔

۹۔قرآن مجید نے 'حرابہ' کی سزائیں بیان کرتے ہوئے یہ ہدایت کی ہے کہ اگر مجرم قانون کی گرفت میں آنے سے پہلے تائب ہو جائیں تو ان پر سزا کا نفاذ لازم نہیں رہے گا۔ ارشاد ہوا ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (المائدہ ۵: ۳۴)

''البتہ جو مجرم تمھارے ان پر قدرت پانے سے پہلے تائب ہو جائیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔''

یہاں سزا کے نفاذ سے قطعی طور پر منع نہیں کیا گیا، اس لیے اس سے کوئی قانونی ممانعت اخذ نہیں کی جا سکتی اور عدالت اگر مصلحت عامہ کے تناظر میں مجرموں کو پوری یا تخفیف شدہ سزا دینا چاہے تو آیت میں کوئی چیز اس سے مانع نہیں، تاہم ایسی کوئی مصلحت پیش نظر نہ ہو تو 'فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ' کی نہایت بلیغ ترغیب یہ تقاضا کرتی ہے کہ عدالت مجرم کے لیے رعایت کے پہلو کو کسی حال میں نظر انداز نہ کرے۔

توبہ کی صورت میں سزا کو معاف کرنے کی یہ ترغیب اصلاً حرابہ کے حوالے سے بیان ہوئی ہے، تاہم اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ چونکہ ایک عمومی اخلاقی اصول پر مبنی ہے، اس لیے اسے حرابہ تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں اور حدود سے متعلق باقی جرائم پر بھی اس کا اطلاق یقیناً ہو گا۔[۳۴]

سزاؤں کے نفاذ کے حوالے سے مذکورہ مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ شریعت کا یہ عمومی رجحان بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس کا اصل زور مجرم کو ہر حال میں سزا دینے پر نہیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، اسے سزا سے بچاتے ہوئے اصلاح احوال کا موقع فراہم کرنے پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پہلو سے ان لوگوں کو جن سے جرم سرزد ہو جائے، یہ ترغیب دی ہے کہ (اگر جرم کے ساتھ کسی بندے کا حق متعلق نہیں ہے تو) وہ اپنے جرم پر پردہ ڈالے رکھیں اور توبہ واستغفار کے ذریعے سے اسے اللہ تعالیٰ سے معاف کرانے کی کوشش کریں۔ آپ نے فرمایا:

من اصاب من هذه القاذورات شيئًا فليستتر بستر اللّٰه فانه من يبدى لنا صفحته نقم عليه كتاب اللّٰه. (موطا امام مالک، رقم ۱۲۹۹)

''جو شخص ان ناپاک چیزوں میں سے کسی میں ملوث ہو جائے تو وہ اس پردے سے اپنے آپ کو چھپا لے جو اللہ نے ڈال رکھا ہے، کیونکہ جو شخص ہمارے سامنے اپنے جرم کو بے نقاب کرے گا، ہم اس پر اللہ کے قانون کو نافذ کر دیں گے۔''

آپ نے معاشرے کے لوگوں کو بھی یہی ترغیب دی ہے کہ وہ ایسے مجرموں کو عدالت میں پیش کرنے سے گریز

۳۴۔ امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن ۲/ ۲۸۰۔ جاوید احمد غامدی، حدود و تعزیرات ۳۰۔

کریں، کیونکہ مقدمہ عدالت میں پیش ہو جانے کے بعد مجرم پر سزا کا نفاذ قاضی کی ذمہ داری قرار پاتا ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تعافوا الحدود فی ما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب. (نسائی، رقم ۴۷۰۳)	''سزاؤں کو آپس ہی میں معاف کر دیا کرو، کیونکہ جو معاملہ مجھ تک پہنچ جائے گا، اس میں سزا دینا لازم ہو جائے گا۔''

ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اسلام میں سب سے پہلے جس شخص کا ہاتھ کاٹا گیا، اسے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اور آپ کو بتایا گیا کہ اس نے چوری کی ہے تو آپ کا چہرہ مبارک اس طرح سیاہ ہو گیا، جیسے اس پر راکھ پھینک دی گئی ہو۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ، آپ کو کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا:

وما یمنعنی وانتم اعوان الشیطان علی صاحبکم واللّٰہ عزوجل عفو یحب العفو ولا ینبغی لوالی امر ان یوتی بحد الا اقامہ. (مسند احمد، رقم ۳۷۸۰)	''میں اس پر سزا نافذ کرنے سے کیسے رک سکتا ہوں، جبکہ تم خود اپنے بھائی کے خلاف شیطان کی مدد کرنے والے ہو؟ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں اور معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں۔ (تمھیں چاہیے تھا کہ اس کو میرے سامنے پیش نہ کرتے، کیونکہ) حکمران کے سامنے جب سزا سے متعلق کوئی معاملہ پیش ہو جائے تو اس کے لیے سزا کو نافذ کرنا ہی مناسب ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ضمن میں ارباب حل وعقد کے لیے بھی یہ راہنما اصول بیان فرمایا ہے کہ ان کی اصل دلچسپی مجرم کو سزا دینے سے نہیں، بلکہ عدل وانصاف کے حدود میں رہتے ہوئے اس کے لیے معافی کی گنجایش تلاش کرنے سے ہونی چاہیے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ادرء وا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان کان له مخرج فخلوا سبیله فان الامام ان یخطئ فی العفو خیر من ان یخطئ فی العقوبة. (ترمذی، رقم ۱۳۴۴)	''جہاں تک ہو سکے، مسلمانوں سے سزاؤں کو ٹالو۔ پس اگر تمھیں کسی مسلمان کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ ملے تو اس کو چھوڑ دو، کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلط فیصلہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کو سزا دینے کا غلط فیصلہ کرے۔''

ماعز اسلمی نے جب زنا کا ارتکاب کیا تو اس کے سرپرست ہزال نے اسے ترغیب دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی عدالت میں پیش ہونے کے لیے آمادہ کیا۔ ماعز کے پیش ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو بار بار اس سے اعراض کرتے ہوئے اسے واپس بھیجنے کی کوشش کی، لیکن جب اس نے سزا کے نفاذ پر اصرار کیا تو اسے رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ پھر جب آپ کو بتایا گیا کہ ماعز سزا سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا تھا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ 'هَلَّا تَرَكْتُمُوْهُ لَعَلَّهُ اَنْ يَّتُوْبَ فَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ'، یعنی تم نے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیا، ممکن ہے کہ وہ توبہ کر لیتا اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتے۔ اس موقع پر آپ نے اس کے سرپرست ہزال سے فرمایا کہ 'لَوْ كُنْتَ سَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ كَانَ خَيْرًا مِّمَّا صَنَعْتَ بِهِ'، یعنی اگر تم اپنی چادر سے اس کو ڈھانپ دیتے تو یہ اس سے بہتر ہوتا جو تم نے اس کے ساتھ کیا ہے۔[35]

ایک مقدمے میں ایک چور کو آپ کے پاس لایا گیا جس نے چوری کا اعتراف تو کر لیا تھا، لیکن اس کے پاس سے چوری شدہ مال برآمد نہیں ہوا تھا۔ آپ نے اس سے کہا کہ میرے خیال میں تم نے چوری نہیں کی، لیکن اس نے کہا کہ نہیں، میں نے چوری کی ہے۔ چنانچہ آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔[36]

عطاء بیان کرتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر کے پاس جب کسی چور کو لایا جاتا تو وہ اس سے پوچھتے کہ کیا تم نے چوری کی ہے؟ کہو: نہیں۔ یہی طریقہ ابوالدرداء اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے، جبکہ حضرت ابن مسعود کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں نے چوری کے ملزم سے کہا کہ کیا تم نے چوری کی ہے؟ کہو: یہ چیز مجھے کہیں سے ملی ہے۔[37]

اس تفصیل سے واضح ہے کہ اسلام کی قانونی اخلاقیات کی رو سے مجرم پر سزا کا نفاذ اسی صورت میں قرین انصاف ہے جب وہ کسی پہلو سے رعایت کا مستحق نہ ہو۔ اگر جرم کی نوعیت و کیفیت اور مجرم کے حالات کسی رعایت کا تقاضا کر رہے ہوں تو اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے سزا کو نافذ کرنا عدل و انصاف اور خود شارع کی منشا کے خلاف ہے۔

یہاں بحث کے تتمہ کے طور پر کلاسیکی فقہی ذخیرے کے اس قانونی تصور پر بھی ایک مختصر تبصرہ برمحل معلوم ہوتا ہے کہ ''اگر 'شبہ' پایا جائے تو 'حد' ساقط ہو جائے گی''، اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہا نے اس تصور کی جو اساس اور جو دائرۂ کار متعین کیا ہے، وہ اس سے مختلف ہے جو ہم نے مذکورہ سطور میں واضح کیا ہے۔ فقہا نے اپنے موقف کا ماخذ استدلال

---

۳۵ مسند احمد، رقم ۲۰۸۸۵۔

۳۶ نسائی، رقم ۴۷۹۴۔

۳۷ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۵۷۴-۲۸۵۸۰۔

کتب فقہ میں 'اِدْرَءُ وا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ'[38] (حدود کو شبہات کی بنیاد پر ٹال دو) کے الفاظ میں نقل ہونے والی ایک روایت کو بنایا ہے، تاہم یہ روایت سرے سے ثابت ہی نہیں اور کتب حدیث میں ان الفاظ کا کوئی وجود نہیں ملتا۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے جو بات کتب حدیث میں بیان ہوئی ہے، وہ ہم اوپر نقل کر چکے ہیں اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

ادرء وا الحدود عن المسلمين ما استطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله فان الامام ان يخطئ في العفو خير من ان يخطئ في العقوبة. (ترمذی، رقم ۱۳۴۴)	''جہاں تک ہو سکے، مسلمانوں سے سزاؤں کو ٹالو۔ پس اگر تمھیں کسی مسلمان کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ ملے تو اس کو چھوڑ دو، کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلط فیصلہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی کو سزا دینے کا غلط فیصلہ کرے۔''

اب جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے تو وہ کسی طرح بھی اسقاط حد کے حوالے سے فقہا کے بیان کردہ قانونی ضابطے کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ اس ضمن میں فقہی ضابطے کے تین بنیادی نکات ہیں اور تینوں محل نظر ہیں:

ایک یہ کہ فقہا سزا کے اسقاط کے اصول کے اطلاق کو فقہی اصطلاح کے مطابق 'حدود'، یعنی شریعت کی متعین کردہ سزاؤں تک محدود قرار دیتے ہیں، حالانکہ روایت میں 'حدود' کے لفظ کو اگر فقہی اصطلاح کے مفہوم میں لیا جائے تو بھی 'فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعُقُوْبَةِ' کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہاں سزا کے نفاذ کے حوالے سے حد اور تعزیر میں فرق پر مبنی کسی تکنیکی ضابطے کا نہیں، بلکہ ایک عمومی اخلاقی اصول کا بیان پیش نظر ہے، جس کا اطلاق ہر قسم کی سزا پر یکساں ہوگا۔

دوسرے یہ کہ فقہی ذخیرے میں حد کو ٹالنے کی اساس 'شبہ' کو قرار دیتے ہوئے اس کی بعض متعین صورتیں، مثلاً شبہ فی الفعل اور شبہ فی المحل وغیرہ بیان کی گئی ہیں، جبکہ مذکورہ روایت کی رو سے سزا میں تخفیف اور رعایت کا اصول محض 'شبہے' کی صورتوں تک محدود نہیں، بلکہ ہر وہ وجہ جو عقلی اور اخلاقی طور پر مجرم کو رعایت کا مستحق بناتی ہو، اس اصول کے تحت داخل ہے۔

تیسرے یہ کہ فقہا نے شبہے کی بنیاد پر حد ٹالنے کو ایک قانونی اور تکنیکی ضابطے کے طور پر بیان کیا ہے جس کی رو سے شبہ پائے جانے کی صورت میں قانونی طور پر حد کے نفاذ کی کوئی گنجایش ہی نہیں رہتی، جبکہ روایت سے واضح ہے

---

[38] جصاص، احکام القرآن ۵/۱۱۱۔ سرخسی، المبسوط ۹/۳۸، ۵۲۔

کہ اس کی نوعیت قاضی کے لیے ایک اصولی ہدایت کی ہے نہ کہ کسی قانونی ضابطے کی۔ چنانچہ اگر سزا میں تخفیف کی کوئی وجہ پائی جائے تو مجرم پر سزا کے نفاذ کا امکان ازخود ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ شبہے کو وزن دینے یا نہ دینے کا فیصلہ بہرحال قاضی کی صواب دید پر منحصر رہے گا۔

حدود کے علاوہ اضافی سزاؤں کا جواز

سزا کے نفاذ میں عملی حالات کی رعایت کی اس بحث میں یہ امر بھی واضح رہنا چاہیے کہ جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات اور دیگر اضافی اسباب جس طرح سزا میں تخفیف کا سبب بن سکتے ہیں، اسی طرح اگر ان کا تقاضا ہو تو حدود کے دائرے میں آنے والے کسی جرم کی شرعاً مقرر کردہ سزا کے علاوہ کوئی زائد سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ سزائیں اصلاً اس صورت سے متعلق ہیں جب جرم کا ارتکاب معمول کے حالات میں اپنی سادہ صورت میں کیا گیا ہو۔ اگر اضافی اسباب کے تحت جرم کی نوعیت سادہ نہ رہے اور حس انصاف معمول کی سزا کے علاوہ بھی کسی سزا کے اضافے کا تقاضا کرے تو ایسا کرنا یقیناً شارع کی منشا کے مطابق ہوگا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی کے جرم میں بار بار ماخوذ ہونے والے مجرموں کو قتل کر دینے کا حکم دیا[39]، اس لیے کہ شراب نوشی اپنی ذات میں ایک جرم ہے، جبکہ اس کو معمول یا پیشے کے طور پر اختیار کر لینا ایک دوسرا جرم ہے اور اگر کوئی مجرم بار بار سزا پانے کے باوجود جرم سے باز نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قابل اصلاح نہیں۔ اسی طرح آپ نے سوتیلی ماں کے ساتھ نکاح اور کسی محرم خاتون کے ساتھ بدکاری کرنے والے کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا[40] جس کی وجہ واضح ہے کہ مجرم نے یہاں صرف زنا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ایک دوسری شرعی حرمت کو بھی پامال کیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں شراب نوشی کرنے والے کو اسی اصول کے تحت رمضان کی ہتک حرمت کی پاداش میں ۲۰ کوڑے زائد لگائے تھے[41]۔ ام ورقہ رضی اللہ عنہا کا ایک غلام اور ایک لونڈی اپنی مالکہ کو قتل کر کے بھاگ گئے۔ جب انھیں پکڑ کر سیدنا عمر کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے ان دونوں کو سولی چڑھا دینے کا حکم دیا[42]۔ یہاں

۳۹؎ ترمذی، رقم ۱۳۶۴۔

۴۰؎ ترمذی، رقم ۱۲۸۲، ۱۴۶۲۔

۴۱؎ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۳۶۲۶۔

۴۲؎ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۵۸۵۰۔

قصاص کی زیادہ تکلیف دہ صورت اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں قتل کے ساتھ ساتھ اپنی مالکہ کے خلاف بدعہدی اور بغاوت کے بھی مرتکب ہوئے تھے۔ اسی طرح احناف کے نزدیک ایسے جرائم جن کی اصل سزا ان کے نزدیک قتل نہیں، مثلاً تیز دھار آلے کے بغیر قتل کرنا، غیر شادی شدہ کی بدکاری، کسی غیر مسلم کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب وشتم کرنا وغیرہ، اگر مجرم بار بار ان کا ارتکاب کرے تو اسے تعزیراً قتل کیا جا سکتا یا مقررہ حد کے علاوہ کوئی اضافی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔[۴۳]

یہ بات عقل عام اور اخلاقیات قانون کی رو سے بھی مسلم ہے کہ جرم اگر اپنی سادہ شکل سے آگے بڑھ کر ایک سے زیادہ جرائم کا مجموعہ بن جائے تو اس کی سزا مفرد نہیں، بلکہ مرکب ہونی چاہیے۔ اسی طرح اگر مخصوص صورت حالات میں معمول کی سزائیں جرائم کی روک تھام کے لیے موثر ثابت نہ ہوں تو بھی اضافی سزاؤں کا نفاذ درست ہوگا۔ ابن العربی لکھتے ہیں:

وهذا ما لم يتتابع الناس فى الشر ولا احلولت لهم المعاصى حتى يتخذوها ضراوة ويعطف الناس عليهم بالهوادة فلا يتناهوا عن منكر فعلوه فحينئذ تتعين الشدة ويزيد الحد لاجل زيادة الذنب وقد اتى عمر بسكران فى رمضان فضربه مائة، ثمانين حد الخمر وعشرين لهتك حرمة الشهر فهكذا يجب ان تتركب العقوبات على تغليظ الجنايات وهتك الحرمات. (احکام القرآن ۳۳۵/۲)

''یہ سزا اس صورت میں ہے جب لوگ جرم کے خوگر نہ ہو چکے ہوں اور وہ انھیں اتنا مرغوب نہ ہو چکا ہو کہ انھوں نے اسے مستقل عادت بنا لیا ہو۔ اگر یہ صورت ہو اور جرم کی سنگینی کا احساس ختم ہو جانے کے باعث لوگوں نے ایک دوسرے کو اس سے روکنا بھی چھوڑ دیا ہو تو جرم کی شناعت بڑھ جانے کے باعث سزا کی سختی اور مقدار میں اضافہ ضروری ہو جائے گا۔ سیدنا عمر کے پاس رمضان میں ایک شرابی کو لایا گیا تو انھوں نے اسے سو کوڑے لگوائے جن میں سے ۸۰ شراب نوشی کی سزا تھے اور بیس رمضان کی حرمت کو پامال کرنے کی۔ اگر جرم کی سنگینی میں اضافہ ہو جائے اور دوسری حرمتیں بھی پامال کی گئی ہوں تو سزائیں بھی اسی طرح مرکب ہونی چاہییں۔''

اس ضمن میں فقہی ذخیرے اور بالخصوص فقہ حنفی کی بعض جزئیات بدیہی طور پر شریعت کی منشا اور عدل وانصاف

۴۳؎ حاشیہ ابن عابدین ۶۲/۴-۶۳۔

کے تقاضوں کے منافی دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر امام ابوحنیفہ کی طرف یہ راے منسوب ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی محرم خاتون کے ساتھ نکاح کر کے اس کے ساتھ مجامعت کرے تو اسے 'عقد نکاح' سے پیدا ہونے والے شبہے کا فائدہ دیتے ہوئے حد سے مستثنیٰ قرار دیا جائے گا اور صرف تعزیری سزا دی جائے گی، خواہ وہ اس فعل کی حرمت سے واقف ہو،[44] حالانکہ یہ جرم کسی رعایت کا نہیں، بلکہ سخت تر سزا کا مستوجب ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کرنے والے کا سر قلم کرنے کا حکم دیا تھا۔[45]

بعض فقہا مردہ عورت کے ساتھ بدکاری کو اس بنیاد پر حد سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں کہ یہ صورت 'زنا' کی عمومی تعریف کے تحت نہیں آتی، تاہم اس کے برعکس مالکیہ کی یہ راے زیادہ قوی دکھائی دیتی ہے کہ مردہ عورت کے ساتھ بدکاری کرنا سنگین تر جرم ہے، کیونکہ اس میں بدکاری کے ساتھ ساتھ لاش کی بے حرمتی کا اضافی جرم بھی پایا جاتا ہے۔[46]

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کے ساتھ اجرت طے کر کے بدکاری کرے تو امام ابوحنیفہ کی راے میں اسے زنا کی سزا نہیں دی جا سکتی، کیونکہ معاہدۂ اجرت اس عمل میں حلت کا شبہ پیدا کرنے کا موجب ہے۔[47] یہاں 'شبہ' کا ایک تکنیکی مفہوم مراد لیتے ہوئے سزا میں تخفیف کی گنجایش پیدا کی گئی ہے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن وجوہ کے پیش نظر سزا کو ٹالنے کی ترغیب دی ہے، ان سے مراد بدیہی طور پر اسقاط سزا کے ایسے وجوہ ہیں جن کی موجودگی میں کسی مجرم پر سزا کا نفاذ حس انصاف کو مجروح کرتا ہو اور اسے معاف کر دینا ہی عدل وانصاف کا تقاضا محسوس ہوتا ہو۔ چنانچہ تکنیکی شبہات کی بنیاد پر سزا میں تخفیف کی گنجایش پیدا کرنا نہ قانون کی حکمت کا تقاضا ہے اور نہ اسے کسی طرح شارع کی منشا ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

فقہی 'نکتہ رسی' کی دلچسپ ترین مثال اس جزیئے میں ملتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نابالغ بچی کے ساتھ زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی، لیکن اگر زنا کے نتیجے میں بچی کی دونوں شرم گاہیں آپس میں مل جائیں تو زانی حد سے مستثنیٰ قرار پائے گا، اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ زنا کی حد تب واجب ہوتی ہے جب یہ فعل کامل صورت میں واقع ہوا ہو اور فعل کے کامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا محل بھی کامل ہو۔ چنانچہ اگر زنا کے نتیجے میں بچی کی دونوں

۴۴؎ سرخسی، المبسوط ۹/۹۹۔

۴۵؎ ترمذی، رقم ۱۲۸۲۔

۴۶؎ وہبہ الزحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۶/۲۷-۲۸، ۶۸۔

۴۷؎ سرخسی، المبسوط ۹/۵۸۔

شرم گاہیں آپس میں نہیں ملیں تو یہ اس کی دلیل ہے کہ محل اس فعل کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اگر شرم گاہیں مل گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محل جماع سرے سے اس فعل کا متحمل ہی نہیں تھا، اس لیے زنا کا فعل کامل صورت میں واقع نہیں ہوا اور اس پر حد نہیں لگائی جا سکتی[۴۸]۔ یہ جزرسی غالباً کسی داد کی محتاج نہیں ہے۔

[باقی]

---

[۴۸] سرخسی، المبسوط ۸۶/۹۔

سیرت النبی

خالد مسعود

اسلام سے قریش کی وحشت کے اسباب

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے قریش کو جو وحشت ہوتی تھی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ بیت اللہ کے متولی ہونے کے حوالے سے انھوں نے جو دین رائج کر رکھا تھا، وہ وہ نہیں تھا جس کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی تھی۔ اسلام کی دعوت اس خود ساختہ نظام پر تنقید کے نشتر چلاتی تھی۔ بیت اللہ پر قریش کے قابض رہنے کے جواز کو اس نے چیلنج کر دیا تھا۔ قریش محسوس کرتے کہ اگر یہ دعوت قوت پکڑ گئی تو یہ کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ان کا دینی پیشوائی کا نظام زمین بوس ہو جائے گا اور ملک میں ان کی مقتدر حیثیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

قریش نے ابراہیمی تصور توحید کو خیر باد کہہ کر بت پرستی کو جو اہمیت دے رکھی تھی، اس کا فائدہ ان کو یوں پہنچتا تھا کہ وہ عرب کے تمام قبائل کے بتوں کو خانہ کعبہ میں جگہ مہیا کر کے ان کو اپنا وفادار بنا سکتے تھے۔ یہ وہی ذہنیت ہے جس کے تحت ہندوستان میں ہندووں نے گوتم بدھ کے بتوں کو اپنے معاشرہ میں جگہ دے کر بدھوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ان کی انفرادیت ختم کر کے بدھ مت کو دیس نکالا دے دیا۔ ہر قبیلہ کا بت کعبہ میں لا لا کر رکھنے کے نتیجہ میں پورا عرب قریش کو نظام شرک کا محافظ سمجھتا تھا اور اس کے بدلے میں ان کو تجارت اور اپنے علاقے میں سے گزرنے پر ان کو راہ داری کی سہولتیں مہیا کرتا تھا۔ ابراہیمی تصور توحید کو اختیار کرنے کی صورت میں یہ فوائد معرض خطر میں پڑ سکتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے قریش کے ایک ایک انحراف اور ہر ہر بدعت کو بالکل نمایاں کر کے رکھ دیا جس سے

قریش پریشان ہو کر رہ گئے۔ یہاں مختصر طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ان عناصر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے جو قریش کے نظریات پر تنقید کی نوعیت کے تھے۔

شرک اور بت پرستی پر گرفت

چونکہ قریش اپنی ہر بدعت اور تصور دین کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کرتے تھے، اس لیے سیدنا ابراہیم کے اسوہ کو قرآن میں کئی مقامات پر اجاگر کر کے بتایا گیا کہ ان کو شرک اور بت پرستی سے شدید نفرت تھی اور اسی نفرت کے باعث انھوں نے اپنی قوم سے ٹکر لی اور بالآخر اپنے وطن سے ہجرت کر کے نکل آئے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ. اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا. اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا. يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا. يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا. يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا. قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا. (مریم ۱۹: ۴۱-۴۶)

''اور کتاب میں ابراہیم کی سرگزشت کو یاد کرو۔ بے شک وہ راست باز اور نبی تھا۔ یاد کرو، جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ، آپ ایسی چیزوں کی پرستش کیوں کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ وہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے میرے باپ، میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے تو آپ میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ، شیطان کی پرستش نہ کیجیے۔ بے شک شیطان خدائے رحمان کا بڑا ہی نافرمان ہے۔ اے میرے باپ، مجھے ڈر ہے کہ آپ کو خدائے رحمان کا کوئی عذاب آ پکڑے اور آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔ وہ بولا: اے ابراہیم، کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمھیں سنگ سار کر دوں گا۔ تم مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ۔''

ان آیات میں بتوں کی پوجا کو ایک بے فائدہ حرکت بتایا گیا ہے جو شیطان کی عبادت کے حکم میں ہے۔ اس حرکت کے باعث آدمی اللہ کے عذاب سے دوچار ہو سکتا ہے۔ سیدھی راہ اس سے بالکل الگ پیغمبر کی اطاعت سے

ملتی ہے:

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِيۡ وَ بَنِيَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ. رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنۡ تَبِعَنِيۡ فَاِنَّهٗ مِنِّيۡ وَ مَنۡ عَصَانِيۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ. رَبَّنَآ اِنِّيۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِيۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِيۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ. رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِيۡ وَمَا نُعۡلِنُ وَمَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَيۡءٍ فِي الۡاَرۡضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ. (ابراہیم ۱۴: ۳۵-۳۸)

’’اور یاد کرو، جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب، اس سرزمین کو پر امن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے، وہ تو مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ اے ہمارے رب، تو جانتا ہے جو ہم پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اللہ سے کوئی چیز مخفی نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔‘‘

ان آیات میں شرک و بت پرستی سے نفرت ہر ہر لفظ سے عیاں ہے۔ پھر بیت اللہ کی ذمہ داریوں کی یاد دہانی ہے جن سے قریش غافل تو تھے ہی، وہ بدعات کو رواج دیے ہوئے تھے۔ قرآن کی یہ باتیں قریش کو کہاں ہضم ہو سکتی تھیں اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی وضاحتیں کرتے ہوں گے تو قریش کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین کیوں نہ کھسکتی ہوئی محسوس ہوتی ہوگی؟

حقیقت توحید

قرآن نے اس حقیقت کو بھی آشکارا کیا کہ اس کائنات میں شکر کے لائق ذات صرف اللہ کی ہے، کیونکہ انسان اسی کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہا ہے، لہٰذا نجات اللہ کے ان بندوں کو حاصل ہوتی ہے جن کو وہ نبیوں کا ساتھ دینے کے لیے منتخب فرما لیتا ہے۔ قرآن نے متعدد نعمتیں گنوا کر سوال کیا کہ کیا ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی ہے جس کو

خدا کے کسی شریک کی طرف منسوب کیا جا سکے یا جس کی بنا پر شریکوں کو عبادت کے لائق سمجھا جا سکے:

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی. آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ. اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا. ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ. اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَ جَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا. ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. بَلْ اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ. اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ. ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ. اَمَّنْ یَّهْدِیْکُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ. ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. تَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ. اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ. ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ. قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ. وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ.

(النمل ۲۷: ۵۹-۶۵)

”کہو کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے۔ اور اس کے ان بندوں پر سلامتی و رحمت ہے جن کو اس نے برگزیدہ کیا۔ کیا اللہ بہتر ہے یا وہ چیزیں جن کو یہ شریک ٹھیراتے ہیں؟ (کیا تمھارے یہ معبود بہتر ہیں) یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پس ہم نے اس پانی سے خوش منظر باغ اگائے۔ تمھارے امکان میں نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگا سکتے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ بلکہ یہ راہ حق سے انحراف اختیار کرنے والے لوگ ہیں۔

(کیا تمھارے یہ اصنام سزاوار شکر ہیں) یا وہ جس نے زمین کو ٹھکانا بنایا اور جس نے اس کے درمیان نہریں جاری کیں اور اس کے لیے اس نے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان جس نے پردہ ڈال دیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے، بلکہ ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(کیا تمھارے یہ شرکا مستحق عبادت ہیں) یا وہ جو محتاج کی دادرسی کرتا ہے، جبکہ وہ اس کو پکارتا ہے، اور اس کے دکھ دور کرتا ہے اور تم کو زمین کی وراثت دیتا ہے، کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہے؟ بہت ہی کم تم لوگ یاددہانی حاصل کرتے ہو!

(کیا تمھارے یہ دیوی دیوتا لائق پرستش ہیں) یا وہ جو بر و بحر کی تاریکیوں میں تمھاری رہنمائی کرتا ہے اور جو ہواؤں کو اپنے باران رحمت سے پہلے خوش خبری بنا کر

بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟
اللہ بہت ہی برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا
شریک ٹھہراتے ہیں۔
(کیا تمھارے مزعومہ شفعا لائق بندگی ہیں) یا وہ جو
خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کا اعادہ کرے گا اور جو تم
کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ کیا اللہ کے
ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ کہو کہ تم اپنی دلیل لاؤ اگر
تم سچے ہو! کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی
ہیں، اللہ کے سوا کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے اور انھیں
پتا بھی نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

جب اس طرح دوٹوک انداز میں کسی کے عقائد کو بے بنیاد قرار دیا جا رہا ہو تو مخالفت میں اس کا خون کیوں کھولنے نہیں لگے گا!

فرشتوں اور جنات کی پوزیشن

اہل عرب فرشتوں اور جنات کو خدا کی ذات میں شریک کرتے یا پھر اس کے حقوق و صفات میں ان کو اس کا ساجھی ٹھہراتے۔ وہ ان سے نفع وضرر وابستہ کرتے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے جتن کر کے ان سے بڑی امیدیں باندھ لیتے۔ فرشتوں کو تو وہ خدا کی بیٹیوں کی حیثیت دیتے، جبکہ جنات اور خدا کے درمیان رشتہ مانتے۔ قرآن نے ان تصورات کے تار و پود بکھیر دیے اور واضح کیا کہ فرشتے ہوں یا جنات، دونوں کو اپنی اوقات خوب معلوم ہے۔ وہ شریک خدا ہونے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ وہ بھی خدا کی بندگی کر کے ہی رب کو راضی کر سکتے ہیں اور یہی اصول انسانوں کے لیے بھی ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ. اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ. اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى

''ان سے پوچھو: کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں
اور ان کے لیے بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں
بنایا اور وہ دیکھ رہے تھے؟ یہ لوگ محض من گھڑت طور پر
یہ بات کہہ رہے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہے اور یہ

الْبَنِيْنَ. مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ. اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ. فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا. وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ. سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ. اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ. فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ. اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ. وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ. وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ. وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ.
(الصّٰفّٰت ۳۷:۱۴۹-۱۶۶)

بالکل جھوٹے ہیں۔ کیا اس نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تم ہوش سے کام نہیں لیتے؟ کیا تمھارے پاس واضح حجت ہے؟ پس پیش کرو تم اپنی کتاب اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

اور انھوں نے خدا اور جنوں کے درمیان بھی رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ اور جنوں کو خوب پتا ہے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ بجز ان کے جو اللہ کے خاص بندے ہیں۔ پس تم اور جن کو تم پوجتے ہو خدا سے برگشتہ نہیں کر سکتے، مگر انھی کو جو جہنم میں پڑنے والے ہیں۔

اور ہم (فرشتوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے اور ہم تو خدا کے حضور بس صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو اس کی تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔"

آخرت کا تصور

اہل عرب آخرت کے معاملہ میں نہایت غیر سنجیدہ تھے۔ وہ اس کو ایک غیر یقینی امر سمجھتے۔ قرآن نے اس کے دل نشین دلائل بھی دیے اور اس صورت حال سے بھی پردہ اٹھایا جو آخرت کے واقع ہونے پر مجرموں اور رسولوں کو جھٹلانے والوں کو پیش آئے گی:

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ. وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ. وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ.

"اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا۔ پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جس دن قیامت واقع ہو گی تو مجرم اس دن مایوس ہو جائیں گے اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ. فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ. وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ. (الروم ۳۰: ۱۱-۱۶)

لیے سفارش کرنے والا نہیں بنے گا۔ اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔
اور جس دن قیامت واقع ہو گی، مومن اور کافر الگ الگ ہو جائیں گے۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے، وہ تو ایک شان دار باغ میں مسرور ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔''

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا. اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا. فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا. ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا. ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا. وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا. (مریم ۱۹: ۶۶-۷۱)

''اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ کیا یہ انسان اس بات پر غور نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا، درا ں حالیکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ پس تیرے رب کی قسم، ہم ان کو بھی اور شیطانوں کو بھی ضرور اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان کو جہنم کے گرد اس طرح حاضر کریں گے کہ وہ دوزانو بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ پھر ہم ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ کر الگ کریں گے جو خدائے رحمان سے سب سے زیادہ سرکشی کرنے والے رہے ہوں گے۔ پھر ہم ان لوگوں کے سب سے زیادہ جاننے والے ہوں گے جو اس جہنم میں داخل ہونے کے سب سے زیادہ سزاوار ہوں گے۔ اور (ان کو حکم دیں گے کہ) تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے۔ یہ تیرے رب کے اوپر ایک طے شدہ امر واجب ہے۔''

وہ صنادید قریش، جو تکبر اور رعونت کے باعث کسی کو بھی خاطر میں لانے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، اپنے بارے میں یہ سن کر کہ وہ اکابر مجرمین کی صف میں کھڑے ہوں گے اور ان کو اپنی سرکشی کی سزا بھگتنی ہو گی، اس دعوت کے

تیوروں سے کیوں نہ برافروختہ ہوتے۔اس کا تو ہر ہر لفظ ان کے لیے ناقابل برداشت اور تن بدن میں آگ لگانے والا رہا ہوگا۔

احکام وآداب حج

قریش کے ہاتھوں میں مسجد حرام اور حج وعمرہ کی عبادت کا انتظام تھا۔ وہ یہ کام اپنی دینی ذمہ داری سمجھ کر بڑی محنت سے سرانجام دیتے، لیکن صدیوں سے جو انحراف وہاں کے طور طریقوں میں درآیا تھا، اس سے احکام خداوندی نظر انداز ہوتے، لہٰذا قریش کو ان معاملات میں بے اعتنائی برتنے سے روکا گیا۔ احکام وآداب حج نئے سرے سے دیے گئے جس سے وہ راہ پھر سے روشن ہوگئی جس پر صدیوں سے تاریکیوں نے ڈیرے جما رکھے تھے:

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ. لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ. فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ. ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ. وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ. حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ. وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ

’’اور یاد کرو جبکہ ہم نے ابراہیم کے لیے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو، اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو۔ اور لوگوں میں حج کی منادی کرو۔ وہ تمھارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے پہنچیں گی۔ تاکہ لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام بھی لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں۔ ان امور کا اہتمام رکھو اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمھارے لیے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں بجز ان کے جو تمھیں

السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ. ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. (الحج ۲۲: ۲۶-۳۲)

پڑھ کر سنا دیے گئے ہیں۔ تو بتوں کی گندگی سے اجتناب کرو اور جھوٹ بات سے بچو۔ اللہ ہی کی طرف یک سو رہو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے، اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور پرندے اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ان امور کا اہتمام رکھو اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے جن مقاصد کے لیے یہ گھر تعمیر کیا تھا، وہ مقاصد تم نے برباد کر دیے۔ بتوں کے تعلق سے شرک کی جو گندگی تم نے اپنے اوپر لاد رکھی ہے، اس سے بچو اور اپنے جی سے چیزوں کو حرام یا حلال ٹھہرانے سے اجتناب کرو۔ حج کے تمام مناسک کی ادائیگی شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہونی ضروری ہے۔ بیت اللہ کے شعائر کی تعظیم کا حق محض ظاہر داری سے ادا نہیں ہو سکتا، اس کے لیے دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔

قرآن نے طواف کے دوران عریانی کو عبادت کا جز قرار دینے کی بدعت کو شیطنت قرار دیا اور بتایا کہ برہنگی سراسر بے حیائی ہے، جس کا حکم خدا کبھی نہیں دے سکتا، لہٰذا مسجدوں میں پورے لباس میں آیا کرو:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا. قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ. اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ. . . . يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ. قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ. كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ

''اور جب یہ لوگ سنگین بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اسی طریق پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور خدا نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو اللہ کبھی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم لوگ اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں؟... اے بنی آدم، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو اور کھاؤ پیو، البتہ اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پوچھو، کس نے حرام ٹھہرایا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور رزق کی پاکیزہ چیزوں کو،

یَّعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷: ۲۸، ۳۱-۳۲)

کہہ دو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انھی کا حصہ ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کر رہے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔''

یاد رہے کہ یہ تبصرے اس دین پر ہیں جو قریش نے رائج کر رکھا تھا اور جس میں عریاں طواف بھی جز دین تھا۔ اس دین کے متعلق ان کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ ابراہیمی دین کی وراثت ہے جو ہمارے بزرگوں کو ملی تھی۔ قرآن نے اس کو سراسر تہمت قرار دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کبھی برائی اور بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ ایسی نسبت اس کی طرف کرنا بھی سوء ادب ہے۔

کھیتی اور جانوروں میں حرام و حلال

حلال و حرام کے ضمن میں مشرکین نے بہت سی بدعات اختیار کر رکھی تھیں۔ وہ ان کو ابراہیمی دین کا ورثہ سمجھتے۔ فرمایا کہ تمھاری یہ سب باتیں بے سند ہیں، لہٰذا جو چیزیں اصلاً حلال ہیں، اگر ان پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے تو ان کو بلا تکلف کھاؤ، لیکن وہ جانور جو تھانوں اور استھانوں پر غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جاتے ہیں، ان کا کھانا حرام ہے:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ. وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ. وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ. اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ. وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ. اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ. وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ. وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰى

''پس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور تم کیوں نہ کھاؤ، ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، جبکہ اس نے وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں، تفصیل سے بیان کر دی ہیں، اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور بے شک، بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعے سے گمراہ کر رہے ہیں۔ ان حد سے بڑھ جانے والوں سے تیرا رب خوب واقف ہے۔ اور چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی۔

اَوْلِيٰٓـئِهِـمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ. (الانعام ٦:١١٨-١٢١)

بے شک جولوگ گناہ کما رہے ہیں، وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پائیں گے۔ اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اور بے شک یہ حکم عدولی ہے۔ اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہا مانو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔''

مطلب یہ ہے کہ شرک کے عقیدہ کے تحت تم نے بدعات کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔ ان بدعات کے مطابق جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے سے بھی اجتناب کرتے ہو اور تمھارا انحصار موہوم شریکوں پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ رب العزت سے اس بے اعتنائی کی تعلیم ابراہیم علیہ السلام نے کبھی نہیں دی۔ اسی طرح ابراہیمی شریعت کے لحاظ سے بہت سے جانوروں میں حرمت کا کوئی پہلو موجود نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود چونکہ وہ تمھاری بدعات کے تحت حرام ہوتے ہیں، اس لیے ان کو اگر اللہ کے نام پر بھی ذبح کیا جائے تو تم ان کے گوشت کو ہاتھ لگانے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ سارا رویہ تمھارے خود ساختہ مذہب کا حصہ ہے۔ یہ اللہ کی صریح نافرمانی ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس، کھیتی اور چوپایوں کے بارے میں ابراہیمی شریعت کا قریش نے جو حلیہ بگاڑ دیا تھا، اس پر سخت گرفت کرتے ہوئے اسے جھوٹ کا پلندہ اور افترا قرار دیا اور واضح کیا کہ اس افترا کا ان کو خدا کے دربار میں بدلہ چکانا پڑے گا۔ فرمایا:

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ. سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ. (الانعام ٦:١٣٨)

''اور کہتے ہیں: فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے۔ ان کو نہیں کھا سکتے، مگر وہی جن کو ہم چاہیں اپنے گمان کے مطابق۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے، محض اللہ پر افترا کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان تمام امور میں جو موقف تھا، وہ قریش کے تصور دین سے اتنا مختلف تھا کہ دونوں میں کوئی مقام اتصال آتا ہی نہیں تھا۔ قریش اس سے سیخ پا ہوتے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ دعوت نہ صرف ہمارے آبائی عقائد کی نفی کر رہی ہے، بلکہ جس دینی نظام کے بل بوتے پر ہم پورے عرب پر اپنی سیادت کا سکہ

جمائے بیٹھے ہیں، اس کو بھی بے بنیاد قرار دے رہی ہے۔ اگر یہ دعوت کامیاب ہوگئی تو ہمیں اپنی پیشوائی اور خانہ کعبہ سے متعلق اپنے مناصب سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس طرح قریش کے دنیاوی مفادات پر جو زد پڑتی تھی وہ ان کو بے کل کر دیتی تھی۔ وہ دعوت دین کی راہ روکنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی مخالفت میں شدت لے آتے، لیکن کسی طرح بات بنتی نظر نہ آتی۔ اس صورت حال میں قرآن پچھلی امتوں کی سرفروشیوں کا حوالہ دیتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کی کامرانی و فتح یابی کی پیشین گوئیاں سنا کر مسلمانوں کا حوصلہ بڑھاتے اور ان کو قریش کی زیادتیوں کا پامردی سے مقابلہ کرنے کے لیے دل مضبوط کرنے کی تلقین فرماتے۔ آخرت میں اہل ایمان کی بلندئ درجات کا وعدہ ان کو اتنی قوت فراہم کرتا کہ وہ قریش کے مظالم کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دیتے۔

(جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم'' سے انتخاب)

سیرت صحابہ

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیرعنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

——— ۱۱ ———

سیرت وعہد

بابلیون کا پادری مقوقس کا خط لے کر حضرت عمرو کے پاس پہنچا۔ اس میں لکھا تھا: تم نے ایک مختصر فوج کے ساتھ ہمارے ملک پر حملہ کر رکھا ہے، دوسری طرف رومیوں کی اسلحہ سے لیس ایک بڑی فوج بھی تم سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ چند معتبر آدمی ہمارے پاس بھیج دو تا کہ جنگ وجدال سے پہلے ہم آپس میں بات چیت کر کے معاملات سلجھا سکیں۔ حضرت عمرو نے پادری کی سربراہی میں آنے والے وفد کو دو دن روک کر رکھا اور یہ جواب بھیجا کہ ہمارا قضیہ تین صورتوں ہی میں حل ہوسکتا ہے: ایک یہ کہ تم اسلام قبول کر کے ہمارے بھائی بن جاؤ، دوسری یہ کہ اگر اسلام نہ لانا چاہو تو جزیہ دے کر ہمارے زیرنگیں ہو جاؤ، تیسری صورت یہ ہے کہ ہم تمھارے ساتھ جہاد جاری رکھیں حتیٰ کہ اللہ ہمارے مابین فیصلہ کر دے۔ مقوقس نے پھر مذاکرات کی دعوت دی تو سیدنا عمرو بن عاص نے ۱۰ افراد کا ایک وفد اس کی طرف روانہ کیا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ان میں شامل تھے، ان کا سیاہ رنگ اور بھاری بھرکم جسم دیکھ کر مقوقس بولا: اس مشکی کو پرے ہٹاؤ اور کوئی دوسرا آدمی مجھ سے بات کرے۔ سب نے ایک آواز

ہو کر کہا: انھی کا جواب ہماری راے ہو گی۔ عبادہ نے دنیا سے بے رغبتی اور شوق شہادت کا اظہار کیا تو مقوقس کو سمجھ نہ آیا۔ اس نے کہا: ہمیں احساس ہے کہ تم مشقت میں پڑے ہوئے ہو، اس لیے ہم تمھارے ساتھ صلح کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ تمھارا ہر سپاہی ہم سے ۲ دینار لے لے، تمھارے سالار کے لیے ہم ۱۰۰ دینار اور خلیفہ کے لیے ۱۰۰۰ دینار مقرر کرتے ہیں۔ یہ رقم لو اور روم کی افواج قاہرہ کے ہاتھوں پٹنے سے بچ جاؤ۔ عبادہ نے رومی جتھے کا ذکر حقارت سے کیا اور یہ آیت پڑھی: 'کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ'، ''کتنے ہی تھوڑی تعداد رکھنے والے گروہ تھے جو اللہ کے حکم سے بڑے گروہوں پر غالب آ گئے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (البقرہ ۲: ۲۴۹)۔ انھوں نے حضرت عمرو کی ہدایت کے مطابق یہ پیش کش دہرائی: اسلام قبول کر لو، جزیہ دو یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور رخصت ہو لیے۔ مقوقس اور اس کے درباری بھی پل عبور کر کے قلعہ واپس چلے گئے۔ خود تو وہ مسلمانوں سے صلح کرنا چاہتا تھا، لیکن اس کے جرنیل مائل بہ جنگ رہے۔ تین دن کے بعد رومی فوج قلعے سے نکلی اور اسلامی فوج پر اچانک حملہ کر دیا۔ مسلمان غافل نہ تھے، سخت لڑائی ہوئی۔ رومیوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا اور وہ پھر قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس موقع پر مقوقس نے قوم کو صلح پر آمادہ کر لیا اور حضرت عمرو بن عاص سے امان طلب کی۔ صلح کا ایک معاہدہ تیار کیا گیا جس کی رو سے ہر مصری پر ۲ دینار جزیہ عائد کیا گیا، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو چھوٹ دی گئی، مصر کی اراضی، مال مویشیوں اور کنیسوں پر مصریوں کا حق تسلیم کیا گیا۔

مقوقس اس معاہدے کی منظوری لینے کے لیے ہرقل کے پاس پہنچا۔ یہ بازنطینی بادشاہ دمشق اور بیت المقدس میں مسلمانوں سے شکست کھا چکا تھا، اس کے باوجود حیران تھا کہ ۱۲ ہزار کی قلیل مسلم فوج نے مضبوط قلعوں میں محفوظ رومی فوجوں کو زیر کر لیا ہے۔ اس نے سارا الزام مقوقس پر دھر دیا اور اسے بزدل قرار دے کر ذلت کے ساتھ نکال باہر کیا۔ بابلیون میں صلح ختم ہونے کی اطلاع محرم ۲۰ھ (دسمبر ۶۴۰) میں پہنچی۔ تب دریاے نیل میں طغیانی ختم ہو چکی تھی، قلعے میں موجود فوج کی تعداد کم ہو چکی تھی اور اسے کہیں سے کمک پہنچ نہ پائی تھی۔ قلعے کے گرد کھدی خندق کا پانی خشک ہوا تو رومیوں نے اس میں آہنی خار ڈلوا دیے، اس طرح اسلامی فوج کی پیش قدمی مشکل ہو گئی تاہم فریقین کی جانب سے تیر اندازی اور سنگ باری ہوتی رہی۔ رومی جب بھی قلعے سے نکلنے کی کوشش کرتے، مسلمانوں کی یورش سے واپس ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ موسم بہار گزر گیا، ۷ ماہ کے طویل محاصرے سے مسلمان تھک چکے تھے، قلعے کے اندر بھی کئی امراض پھوٹ پڑے تھے۔ ربیع الاول ۲۰ھ (مارچ ۶۴۱) میں، جبکہ دریاے نیل خشک ہو چکا تھا، ہرقل کی موت کی خبر پہنچی۔ مقوقس کو رسوا کرنے کے بعد اسے بخار نے آن لیا تھا۔ اسی مہینے کی ایک رات حضرت زبیر بن عوام

رضی اللہ عنہ نے قلعۂ بابلیون کی بیرونی خندق پھلانگ کر دیوار کے ساتھ سیڑھی لگائی اور اندر اتر گئے۔ کچھ سپاہی ان کے ساتھ تھے، انھوں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا، اس طرح اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ قبطی رومیوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے، ان کے کئی افراد نے اسلام قبول کر لیا اور امور سلطنت میں اسلامی حکومت کے معاون بن گئے۔ اب حضرت عمرو بن عاص اس انتظار میں تھے کہ کب امیر المومنین عمر بن خطاب ان کو مصر کی آخری مہم فتح اسکندریہ کی اجازت دیتے ہیں۔ انھوں نے قلعہ اور جزیرۂ روضہ کے مابین اور جزیرہ اور جیزہ کے مابین کشتیوں کے پل بنوا دیے تاکہ دریاے نیل کو آسانی سے عبور کیا جا سکے۔ سیدنا عمر جانتے تھے کہ تین ماہ بعد دریا پھر چڑھ آئے گا، تب اسکندریہ جانا ممکن نہ ہو گا۔ انھوں نے اذن سفر دے دیا تو حضرت عمرو نے بابلیون میں مسلم چھاؤنی قائم کر کے حضرت خارجہ بن حذافہ کو اس کا انچارج مقرر کیا اور خود اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

ادھر ہرقل (Heraclius) کی موت کے بعد رومی دار السلطنت قسطنطنیہ میں اقتدار کی کش مکش شروع ہو گئی تھی۔ ہرقل کی دوسری بیوی مارٹینا (Martina) سریر سلطنت پر اپنے بیٹے ہریقلونس (Heraklonas) کو بٹھانا چاہتی تھی، جبکہ ہرقل اپنی وصیت میں اپنی پہلی بیوی فبیہ یوڈوکیا (Fabia Eudokia) کے بیٹے قسطنطین ثالث (Constantine III) اور ہریقلونس، دونوں کو سلطنت کا وارث قرار دے چکا تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے ۴ ماہ بعد ہی قسطنطین دق (Tuberculosis) میں مبتلا ہو کر چل بسا تو اس کی سوتیلی ماں مارٹینا پر اسے زہر دینے کا الزام لگایا گیا۔ ہرقل کا پوتا اور قسطنطین کا بیٹا قنسطانس ثانی (Constans II) ملکہ کے خلاف مہم میں پیش پیش تھا۔ اسے اپنے چچا ہریقلونس کے ساتھ شریک اقتدار کیا گیا تو یہ کشاکش اختتام کو پہنچی۔ تبھی وہ مسیحی وفد مصر روانہ کیا گیا جو قسطنطین نے مرنے سے پہلے ترتیب دیا تھا۔ رومن کیتھولک چرچ کا متنازع پیشوا کائرس (Cyrus) اس کا سربراہ تھا، کئی پادری اور ایک بڑی فوج اس کے ساتھ تھی۔ اس مذہبی مہم میں حصہ لینے والے رمضان ۲۰ھ (ستمبر ۶۴۱) میں ایک بڑے بحری بیڑے کے ذریعے سے مصری دار الخلافہ پہنچے تو مصر کے نجات دہندہ کے طور پر ان کا استقبال کیا گیا۔ الفریڈ بٹلر (Alfred Butler) کا خیال ہے کہ کائرس مسلمانوں سے صلح کا ارادہ رکھتا تھا، کیونکہ اسے اپنی فتح کی امید نہ تھی اور وہ صلح ہی میں عیسائی مذہب کا فائدہ سمجھتا تھا۔

اسلامی فوج نے جمادی الاولیٰ ۲۰ھ (مئی ۶۴۱) میں فاتح مصر حضرت عمرو بن عاص کی سربراہی میں بابلیون سے نکل کر دریاے نیل کے بائیں کنارے پر اپنا سفر شروع کیا۔ قبطی سرداروں کی ایک جماعت حضرت عمرو کے ساتھ تھی، انھی کے گائیڈ فوج کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ حضرت ابن عاص کا ارادہ تھا کہ دائیں کنارے پر واقع قلعۂ نقیوس

پر قبضہ کیا جائے۔ قبل اس کے کہ وہ دریاے نیل عبور کرتے، طرنوط کے مقام پر ان کی رومیوں سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ ایک مختصر جنگ کے بعد دشمن فوج نے شکست کھائی۔ نقیوس کے عامل کی حکمت عملی تھی کہ اسلامی فوج کو دریاے نیل کی داہنی نہر پار کرنے سے روکا جائے، اس لیے وہ اپنی فوج کشتیوں پر سوار کرا کے شہر سے باہر نکل آیا۔ سیدنا عمرو نے رومی فوج کو کشتیوں سے اترنے کا موقع ہی نہ دیا۔ حاکم نقیوس کو یوں لگا، جیسے مسلمان نہر میں گھس کر اسے آن لیں گے۔ اس نے تیزی سے اپنے جہاز کا رخ اسکندریہ کی طرف موڑ دیا۔ فوجیوں نے اپنے سالار کو بھاگتے دیکھا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، ان میں سے زیادہ تر مارے گئے۔ مسلمان شہر نقیوس میں نچنت داخل ہو گئے۔ قدیم مصری مورخ حنا نقیوسی اور اس کی متابعت میں Butler کا یہ الزام کہ اسلامی فوج نے گھروں اور کنیسوں میں داخل ہو کر عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کیا، کسی طرح درست نہیں۔ اسلامی آداب حرب، ہتھیار ڈالنے والوں، عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے سختی سے منع کرتے ہیں۔ ایسا کرنا مسلمانوں کا کبھی شیوہ نہیں رہا اور عہد فاروقی میں ایسا ہونا تو ناممکن تھا کیونکہ سیدنا عمر اپنے عمال کی چھوٹی سی غلطی کا بھی سخت اور کڑا محاسبہ کرتے تھے۔

حضرت عمرو نے شریک بن سمی کی قیادت میں ایک دستہ اسکندریہ فرار ہونے والوں کے تعاقب میں بھیجا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ وہ اپنے تھوڑے سے فوجیوں کے ساتھ اتنے بھگوڑوں پر غلبہ نہیں پا سکتے تو ایک ٹیلے پر پناہ لی اور مالک بن ناعمہ کو کمک لانے کے لیے نقیوس بھیجا۔ رومیوں کو اطلاع ملی کہ اسلامی فوج کو مدد آ رہی ہے تو وہ پھر سے فرار ہو گئے۔ اب پورا لشکر اس ٹیلے پر آن پہنچا جسے اب ''کوم شریک'' (شریک کا ٹیلہ) کہا جاتا ہے۔ اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ ایک رومی پلٹن سُلطیس کے مقام پر جمع ہے۔ حضرت عمرو نے بھی اپنے جیش کے ساتھ سُلطیس کا رخ کیا۔ یہاں سخت لڑائی ہوئی، رومی فوج شکست کھا کر بھاگی تو دمنہور سمیت راستے کے کسی مقام پر نہ ٹھہری اور سیدھا اسکندریہ کے پاس کریون کے قلعوں میں جا پناہ لی۔ اسکندریہ میں موجود رومی کمانڈر ان چیف تھیوڈر شہر اسکندریہ کو محفوظ رکھنے کے لیے فوج کے ساتھ کریون کے قلعہ میں منتقل ہو گیا۔ اسے اطمینان تھا کہ قلعے کی مضبوط دیواریں مسلمانوں کی یورش روک لیں گی۔ اسلامی فوج کے کچھ افراد پچھلے معرکوں میں کام آ گئے تھے، کچھ کو مفتوحہ شہروں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا، اس طرح اس کی اصل ۱۵ ہزار کی نفری برقرار نہ رہی تھی۔ تاریخ کے اوراق مزید فوج کی آمد کے ذکر سے خالی ہیں، تاہم محمد حسین ہیکل نے گمان کیا ہے کہ بصرہ و کوفہ اور شام کی چھاؤنیوں سے کچھ کمک ضرور پہنچی ہو گی اور ۲۰ ہزار کے قریب نفری کریون پہنچی ہو گی۔ کریون میں جنگ کا بازار گرم ہوا، کئی دن گزرنے کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مسلمانوں نے بڑی دلیری دکھائی، تب بھی رومی فوج کا پلڑا بھاری نظر آتا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ حضرت عمرو بن

عاص کو صلوٰۃ خوف پڑھانا پڑی۔ اسی جنگ میں ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرو شہید ہوئے۔ کہیں تیرھویں چودھویں دن رومی دفاع کمزور پڑا اور قلعۂ کریون مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

فتح کے بعد حضرت عمرو بن عاص نے کریون میں قیام نہ کیا، وہ جیش اسلامی لے کر فوراً اسکندریہ پہنچے، لیکن شہر کے دروازے ان پر وانہ ہوئے، الٹا شہر پناہ پر سے منجنیقیں پتھر برسانے لگیں۔ اسکندریہ ایک محفوظ شہر تھا، اس کے شمال میں بحیرۂ روم موجیں مار رہا تھا، جنوب میں جھیل مریوط تھی اور مغرب میں نہر ثعبان بہ رہی تھی۔ اس جزیرہ نما کو صرف مشرق کی طرف سے رسائی ہو سکتی تھی، جہاں بلند و بالا قلعوں کی فصیلیں راستہ روکے کھڑی تھیں۔ اسلامی فوج ادھر ہی سے آئی تھی۔ اسکندریہ کی بندرگاہ اور تمام ساحلی مقامات رومی کنٹرول میں تھے، اس لیے محصوروں کو سمندر کی طرف سے ہر طرح کی مدد پہنچ رہی تھی۔ ۵۰ ہزار رومی شہر کی حفاظت پر مامور تھے۔ حضرت عمرو نے اپنی فوج کو منجنیقوں کی مار سے دور ٹھہرا دیا۔ قصر فاروس کے باہر فوج کو قیام کیے ۲ ماہ گزر گئے اور طرفین کی جانب سے کوئی جنبش نہ ہوئی۔ جب اسلامی لشکر حرکت کر کے مقس تک آیا تو جھیل کی طرف سے ایک رومی دستہ نکلا اور ۱۲ مسلمانوں کو شہید کر کے واپس لوٹ گیا، چھوٹی موٹی جھڑپیں بعد میں بھی ہوتی رہیں۔ حضرت عمرو نے اسکندریہ میں رہتے ہوئے مفتوحہ علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھا۔ انھوں نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے کئی بار اپنے دستوں کو اطراف کے شہروں میں بھیجا۔ ساڑھے چار ماہ گزر گئے، محاصرہ لمبا اور بے ثمر ہو گیا تو مدینہ میں امیر المومنین عمر بن خطاب مضطرب ہو گئے۔ انھیں یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ کہیں ان کی فوج عیش دنیا میں پڑ کر سست نہ ہو گئی ہو۔ انھوں نے حضرت ابن عاص کو خط لکھا کہ اللہ تعالیٰ اسی قوم کی مدد کرتا ہے جو نیک نیت ہو۔ لوگوں کو صدق نیت اور صبر کے ساتھ جہاد کرنے پر انگیخت کرو۔ بروز جمعہ زوال کے وقت سب یک جان ہو کر حملہ کر دو۔ حضرت عمرو بن عاص بھی سوچ میں پڑے ہوئے تھے کہ شہر کو کیسے زیر کیا جائے۔ انھوں نے سپاہیوں کو حضرت عمر کا خط سنایا اور ۲ رکعت نفل ادا کر کے اللہ سے فتح کی دعا مانگنے کی تلقین کی۔ پھر خیال آیا کہ صحابہ ہی میں سے کوئی یہ مرحلہ سر کر سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت کو بلا کر کمان سونپی۔ ایک ہی روز کی سخت لڑائی کے بعد مسلمان شہر اسکندریہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ چند انفرادی واقعات کے سوا اس جنگ (۲۱ھ) کی کوئی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی۔ اسکندریہ کے مرمریں ستون، عالی شان معابد و کنائس، شاہی محلات اور شان دار سڑکیں دیکھنے والوں کو مبہوت کر رہی تھیں۔ مسلم مورخین کے برعکس اے جے بٹلر (A J Butler) کا کہنا ہے: اسکندریہ کے محاصرے کے دوران میں اطراف کو جانے والی مہمات کی حضرت عمرو بن عاص خود کمان کرتے رہے۔ ایک بار وہ بابلیون میں تھے کہ کائرس (Cyrus) ان کے پاس پہنچا اور صلح کی

پیش کش کی۔ اسکندریہ کے باشندوں کو معلوم ہوا تو سخت ملامت کی اور اسے مارنے کے درپے ہوئے، لیکن اس نے اپنی مذہبی سیادت کی بنا پر انھیں قائل کر لیا اور جزیے کی پہلی قسط اور کچھ اضافی سونا جمع کر کے خود حضرت عمرو کے حوالے کیا۔ بٹلر کے اس اختراع ذہنی کی کوئی تاریخی سند نہیں پائی جاتی۔ حضرت عمرو بن عاص نے حضرت معاویہ بن حدیج کو فتح کی بشارت دے کر مدینہ بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اذان دلائی، اہل ایمان کو جمع کر کے خوش خبری سنائی اور نماز شکرانہ ادا کی۔

شکست کے بعد رومی سمندر کی طرف سے فرار ہو گئے، کچھ سرزمین مصر میں پھیل گئے۔ مقوقس نے اسکندریہ نہ چھوڑا، وہ اپنے محل میں مقیم رہا، ربیع الاول ۲۱ھ (مارچ ۶۴۲) میں یہیں فوت ہوا اور اسی شہر میں دفن ہوا۔ سقوط اسکندریہ کے بعد مصر کے اکثر شہروں کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھل گئے۔ بحیرۂ روم کے ساحل کے قریب واقع شہروں اخنا، بلہیب، برلس، دمیاط اور تنیس میں رومی چھاؤنیاں تھیں، اس لیے مسلمانوں کے قبضے میں نہ آئے۔ حضرت عمرو نے کچھ دستے ان کی طرف بھیجے تو وہاں کے باشندگان نے مصالحت کر لی۔ صرف اہل تنّیس نے مزاحمت دکھائی اور بزور جنگ زیر ہوئے۔ برقہ اور طرابلس میں بھی رومی فوجیں موجود تھیں جو جیش اسلامی پر حملہ کرنے کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں تھیں۔ حضرت ابن عاص خود فوج لے کر وہاں گئے، سکان برقہ نے جلد صلح کر لی، رومیوں کی ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا اور باقیوں نے ۱۳ ہزار دینار سالانہ جزیہ دینا مانا۔ اب (۲۲ھ میں) حضرت عمرو کا رخ طرابلس کے ساحلی شہر کی طرف تھا۔ وہاں کے باشندگان قلعہ بند ہو کر سمندر کی جانب سے مدد آنے کا انتظار کرنے لگے، کئی ہفتے گزر گئے، ان کو کمک نہ آئی۔ اسی اثنا میں مسلمانوں کو اطلاع ملی کہ سمندر کی جانب شہر کے گرد کوئی فصیل نہیں۔ ان کی ایک جماعت اس طرف گئی اور نعرۂ تکبیر بلند کیا، رومی شتابی سے جہازوں پر بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ طرابلس کا دروازہ کھل گیا اور اسلامی فوج حضرت عمرو کی سربراہی میں اندر داخل ہو گئی۔

اس مرحلے پر جبکہ مصر کاملاً اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکا تھا، حضرت عمرو بن عاص نے خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب سے تیونس اور شمالی افریقہ میں پیش قدمی کرنے کی اجازت مانگی۔ ان کی طرف سے انکار ہوا تو وہ واپس برقہ آئے، جہاں بربر قبائل نے ان سے معاہدۂ صلح کیا۔ وہ مصر کی جنوبی سرحدوں کو محفوظ دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے حضرت عقبہ بن نافع کی قیادت میں ایک مہم پڑوسی شہر نوبہ کی طرف بھیجی۔ وہاں کے لوگ ماہر تیر انداز تھے، سیدھا آنکھ کی پتلی کا نشانہ لے کر آنکھ پھوڑ دیتے تھے۔ سخت قتال کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا تو سرحدی جھڑپیں جاری رہیں، حتیٰ کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان کے عہد میں ان سے معاہدۂ صلح طے پایا۔

جنگ وقتال سے فارغ ہونے کے بعد حضرت عمرو نے اہل مصر کے لیے امان عامہ کا اعلان کیا۔انھوں نے تمام ظالمانہ ٹیکس ختم کر دیے اور کہا: کسی کو زبردستی مسلمان نہ بنایا جائے گا۔ایک فوجی جرنیل کے بجاے اب مدبر سیاست دان کا رول ان کے سامنے تھا۔انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اسلامی حکومت کا دار الخلافہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔حضرت عمر نے ایک اصولی حکم دے کر فیصلہ حضرت عمرو پر چھوڑ دیا: میں نہیں چاہتا کہ تم ایسی جگہ ٹھکانا بناؤ، جہاں میرے اور مسلمانوں کے بیچ سردیوں یا گرمیوں میں دریاے نیل حائل ہو جائے۔اس اصول کی روشنی میں حضرت عمرو کو فسطاط سے بہتر کوئی جگہ نظر نہ آئی، یہ فراعنہ کے قدیم دار الحکومت منف اور قلعۂ بابلیون کے قریب دریاے نیل پر واقع تھا۔یہاں سے مدینہ جانے کے لیے دریاے نیل پار نہیں کرنا پڑتا۔بابلیون کے محاصرے کے دوران میں حضرت عمرو نے یہاں ایک خیمہ (یا فسطاط) نصب کر رکھا تھا۔جب قلعہ فتح ہو گیا تو انھوں نے خیمہ اکھاڑنے کا حکم دیا۔جب انھیں نظر آیا کہ ایک جنگلی کبوتری نے اس میں انڈے دے رکھے ہیں تو اسے قائم رہنے دیا اور قلعے کی نگرانی کرنے والوں کو بھی ہدایت کی کہ خیمہ نہ اکھاڑا جائے۔اب حضرت عمرو نے خیمے والی جگہ کو مسجد بنا دیا اور آس پاس مسلمانوں کو اپنے گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔انھوں نے مسجد کے پاس ایک گھر امیر المومنین کے لیے بھی بنوایا اور ان کو اطلاع بھیجی۔حضرت عمر نے جواب بھیجا کہ حجاز میں رہنے والے شخص کا کیا کام کہ وہ مصر میں گھر بنائے؟ اسے مسلمانوں کے بازار میں تبدیل کر دو۔انھوں نے شدید غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسجد میں جو منبر تم نے بنوایا ہے، وہ مسلمان نمازیوں کی گردنوں سے بھی بلند ہے، اسے فوراً تڑوا دو۔تمھارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ کھڑے ہو کر خطبہ دو اور نمازی تمھاری ایڑیوں سے نیچے ہوں۔

حضرت عمرو بن عاص نے لارڈ بشپ بنیامین کو دعوت دی کہ وہ مصر لوٹ آئیں۔وہ رومی حکام اور کائرس کے مظالم سے تنگ آ کر صحرا میں روپوش ہو چکے تھے۔جب وہ اپنے قبطی عقیدت مندوں میں لوٹ آئے تو ان میں فرحت کی لہر دوڑ گئی۔

مطالعۂ مزید: تاریخ الامم والملوک (طبری)؛ الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)؛ فتوح البلدان (بلاذری)؛ الفاروق عمر (محمد حسین ہیکل)؛ تاریخ اسلام (شاہ معین الدین ندوی)؛ The Arab Conquest of Egypt and the last thirty years of Roman dominian (Alfred J Butler)

[باقی]

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کے ایک باب کا خلاصہ ہے جس میں نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

قانون دعوت

دین کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ اِس دنیا میں حق کو اختیار کریں، وہ اُسے اختیار کر لینے کے بعد دوسروں کو بھی برابر اُس کی تلقین و نصیحت کرتے رہیں۔ دین کا یہی مطالبہ ہے جس کے لیے بالعموم دعوت و تبلیغ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اِس کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس میں دعوت کی ذمہ داری اہل ایمان کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے بالکل الگ الگ صورتوں میں اُن پر عائد کی گئی ہے۔ اِسے ہم درج ذیل عنوانات کے تحت بیان کر سکتے ہیں:

پیغمبر کی دعوت

اللہ تعالیٰ کے جو پیغمبر بھی دنیا میں آئے ہیں، دعوت الی اللہ اور انذار و بشارت کے لیے آئے ہیں۔ اِن میں سے نبیوں کا انذار و بشارت تو کسی وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا، لیکن نبیوں میں سے اللہ تعالیٰ جنھیں رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے، اُن کے بارے میں البتہ، قرآن نے بتایا ہے کہ وہ اِس انذار کو اپنی قوموں پر شہادت کے مقام تک پہنچا دینے کے لیے مامور تھے۔ قرآن کی اصطلاح میں اِس کے معنی یہ ہیں کہ حق لوگوں پر اِس طرح واضح کر دیا جائے کہ اِس کے بعد کسی شخص کے لیے اُس سے انحراف کی گنجایش نہ ہو۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو

اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور اِس سے انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ بچشم سر دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہی شہادت ہے۔ رسولوں کی دعوت میں انذار، انذار عام، اتمام حجت اور ہجرت و براءت کے مراحل سے گزر کر یہ شہادت جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اِن رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور اِن کی دعوت کے منکرین پر اِسی دنیا میں اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

ذریت ابراہیم کی دعوت

یہ دعوت وہی شہادت ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ذریت ابراہیم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اِس شہادت کے لیے اُسی طرح منتخب کیا اور اِس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کا حکم دیا ہے، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔

ذریت ابراہیم کا یہی منصب ہے جس کے تحت یہ اگر حق پر قائم ہو اور اُسے بے کم و کاست اور پوری قطعیت کے ساتھ دنیا کی سب قوموں تک پہنچاتی رہے تو اُن کے نہ ماننے کی صورت میں اللہ تعالیٰ اِن قوموں پر اِسے غلبہ عطا فرماتے اور اِس سے انحراف کرے تو اِنھی کے ذریعے سے ذلت اور محکومی کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

علما کی دعوت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انذار کی ذمہ داری اِس امت کے علما کو منتقل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگ نکل کر آئیں، دین کا علم حاصل کریں اور اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اُسے آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کی اِس صورت میں یہ چند باتیں لازماً ملحوظ رہنی چاہییں:

اول یہ کہ اِس کے لیے اٹھنے والے جس حق کو لے کر اٹھیں، اُس پر اُن کا اپنا ایمان بالکل راسخ ہونا چاہیے۔ وہ جو بات بھی لوگوں کے سامنے پیش کریں، اُس پر اُن کے دل و دماغ کو اِس طرح مطمئن ہونا چاہیے کہ وہ خود بھی محسوس کریں کہ یہ اُن کے دل کی آواز اور روح کی صدا ہے جو اُن کی زبان پر آئی ہے۔ وہ اپنی ساری شخصیت کو اپنے رب کے حوالے کر کے اِس میدان میں اتریں اور جس چیز کی طرف لوگوں کو بلائیں، اُس کے بارے میں سب سے پہلے خود یہ اعلان کریں کہ وہ پورے دل اور پوری جان سے اُس پر ایمان لائے ہیں۔

دوم یہ کہ اُن کے قول و عمل میں کسی پہلو سے کوئی تضاد نہ ہو۔ وہ جس چیز کے علم بردار بن کر اٹھیں، سب سے پہلے خود اُسے اپنائیں اور جس حق کی لوگوں کو دعوت دیں، اُن کا عمل بھی اُسی کی شہادت دے۔

سوم یہ کہ وہ حق کے معاملے میں کسی مداہنت سے کام نہ لیں۔ دین کی چھوٹی سی چھوٹی حقیقت بھی جو اُن پر واضح ہو جائے، اُسے دل سے قبول کریں، زبان سے اُس کی گواہی دیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا کیے بغیر اُسے بے کم و کاست دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔

چہارم یہ کہ اپنے انذار کا ذریعہ وہ قرآن مجید کو بنائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن نے اِسی کا حکم دیا ہے اور آپ اِسی بنا پر پوری دنیا کے لیے نذیر ہیں۔ علما درحقیقت آپ ہی کے اِس انذار کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

ریاست کی دعوت

مسلمانوں کو اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی خود مختاری حاصل ہو جائے تو اُن کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو اِس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائیں، برائی سے روکیں اور بھلائی کی تلقین کریں۔ قیام حکومت کے بعد یہ فرض مسلمانوں کے ارباب حل و عقد پر عائد ہوتا ہے۔ اُن پر لازم ہے کہ نظم ریاست سے متعلق دوسری تمام فطری ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ وہ اپنی یہ ذمہ داری بھی لازماً پوری کریں۔

فرد کی دعوت

فرد کی دعوت اپنے ماحول اور اپنے دائرۂ عمل میں ایک دوسرے کو بھلائی کی نصیحت کرنا اور برائی سے روکنا ہے۔ دعوت کی اِس صورت میں داعی اور مدعو الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص جس طرح ہر وقت داعی ہے، اِسی طرح مدعو بھی ہے۔ یہ فرض باپ کو بیٹے کے لیے اور بیٹے کو باپ کے لیے، بیوی کو شوہر کے لیے اور شوہر کو بیوی کے لیے، بھائی

کو بہن کے لیے اور بہن کو بھائی کے لیے، دوست کو دوست کے لیے اور پڑوسی کو پڑوسی کے لیے، غرض یہ کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ متعلق ہر شخص کے لیے ادا کرنا چاہیے۔ وہ جہاں یہ دیکھے کہ اُس کے متعلقین میں سے کسی نے کوئی خلاف حق طریقہ اختیار کیا ہے، اُسے چاہیے کہ اپنے علم اور اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق اُسے راستی کی روش اپنانے کی نصیحت کرے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ صبح ہم کسی شخص کو بھلائی کی ترغیب دیں اور شام کے وقت وہ ہمارے لیے یہ خدمت انجام دے۔ آج ہم کسی کو کوئی حق پہنچائیں اور کل وہ ہمیں اِس کی تلقین کرے۔ غرض یہ کہ جب موقع میسر آئے، ہر مسلمان کو اپنے دائرۂ عمل میں یہ کام لازماً انجام دیتے رہنا چاہیے۔

دعوت کی حکمت عملی

دعوت کی یہ حکمت عملی اِس کی ہر صورت سے متعلق ہے۔ قرآن نے اِسے ایک اصل اصول کی حیثیت سے بیان کیا ہے اور یہ درج ذیل تین نکات پر مبنی ہے:

اول یہ کہ دعوت ہمیشہ حکمت و موعظت اور مجادلۂ احسن کے اسلوب میں پیش کرنی چاہیے۔ حکمت سے مراد دلائل و براہین ہیں اور موعظت حسنہ سے دردمندانہ تذکیر و نصیحت۔ مدعا یہ ہے کہ داعی جو بات بھی کہے، وہ دلیل و برہان اور علم و عقل کی روشنی میں کہے اور اُس کا انداز چڑھ دوڑنے اور دھونس جمانے کا نہیں، بلکہ خیر خواہی اور شفقت و محبت کے ساتھ توجہ دلانے کا ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ بحث و مباحثہ کی نوبت بھی اگر آ جائے تو اُس کے لیے پسندیدہ طریقے اختیار کیے جائیں اور اِس کے جواب میں حریف اشتعال انگیزی پر اتر آئے تو اُس کی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے بجاے داعی حق ہمیشہ مہذب اور شایستہ ہی رہے۔

دوم یہ کہ داعی کی ذمہ داری صرف دعوت تک محدود ہے، یعنی بات پہنچا دی جائے، حق کو ہر پہلو سے واضح کر دیا جائے اور ترغیب و تلقین میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔ اُس نے اگر اپنا یہ فرض صحیح طریقے سے ادا کر دیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوا۔ لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ داعی کو نہ داروغہ بننا چاہیے، نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔ یہ سب معاملات اللہ تعالیٰ سے متعلق ہیں۔ داعی حق کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنی اِس ذمہ داری سے ہرگز کوئی تجاوز نہ کرے۔

سوم یہ کہ دعوت کے مخاطبین اگر ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی پر اتر آئیں تو داعی کو اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے اتنا بدلہ لینے کا حق ہے جتنی تکلیف اُسے پہنچائی گئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔ اِس صبر کے معنی یہ ہیں کہ حق کے داعی ہر اذیت برداشت کر لیں، لیکن نہ انتقام کے لیے کوئی اقدام کریں، نہ مصیبتوں اور تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے موقف میں کوئی ترمیم و تغیر کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اِس موقع پر صبر کرنے والوں کے لیے بڑی نعمت کا وعدہ ہے۔ اِس کا نتیجہ دنیا میں بھی اُن کے لیے بہترین صورت میں ظاہر ہو گا اور قیامت میں بھی خدا نے چاہا تو وہ اِس کے بہترین نتائج دیکھیں گے۔

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق اور شعبۂ تعلیم و تربیت کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

جہیز

سوال: جہیز کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کیا ہے؟ (محمد عمر بن عبداللہ)

جواب: شادی کے موقع پر والدین کا اپنی بیٹی کو جہیز دینا ایک معاشرتی رسم و رواج ہے۔ دین نہ اسے نکاح کی کوئی شرط قرار دیتا ہے اور نہ اس پر کوئی پابندی لگاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ طریقہ بھی درست ہے کہ لڑکے کی طرف سے دی گئی مہر کی رقم ہی سے یہ جہیز خرید لیا جائے اور یہ بھی درست ہے کہ لڑکی کے والدین اپنی خوشی اور سہولت سے بیٹی کو بطور جہیز جو دینا چاہیں، وہ دیں۔ دین کو اس پر نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ وہ اس کی کوئی ترغیب ہی دیتا ہے۔

البتہ، یہ ایک اہم بات ہے کہ اگر یہ جہیز ایک ایسی رسم کی صورت اختیار کر جائے جو معاشرے میں ظلم و زیادتی اور دیگر مفاسد کا باعث بن جائے، اس کے نتیجے میں شادی بیاہ مشکل ہو جائے، جیسا کہ ہمارے معاشرے کی صورت حال ہے تو پھر دین اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا اور مسلمانوں کو یہ ترغیب دلاتا ہے کہ وہ اس میں موجود خرابیوں کو لازماً دور کریں۔

نصاب زکوٰۃ میں تبدیلی کا حق

سوال: کیا ریاست زکوٰۃ کے نصاب میں تبدیلی کر سکتی ہے؟ (اے کے فریدی)

جواب: استاد محترم غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق زکوٰۃ کے نصاب میں ریاست اجتہاد کر سکتی ہے، لہٰذا ریاست جو نصاب بھی طے کر دے گی، اس سے کم مال یا پیداوار پر زکوٰۃ عائد نہیں ہو گی۔ وہ اپنی کتاب ''قانون عبادات'' میں زکوٰۃ کے حوالے سے بعض عام غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے یہ لکھتے ہیں کہ:

''چند باتیں مزید واضح رہنی چاہییں:

...ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے، ان کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کر سکتی ہے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقصد سے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ نہیں لی اور مال، مواشی اور زرعی پیداوار میں اس کا نصاب مقرر فرمایا۔ یہ نصاب درج ذیل ہے:

مال میں ۵ اوقیہ/ ۶۴۲ گرام چاندی

پیداوار میں ۵ وسق/ ۶۵۳ کلوگرام کھجور

مواشی میں ۵ اونٹ، ۳۰ گائیں اور ۴۰ بکریاں۔

آپ کا ارشاد ہے: 'قد عفوت عن الخیل و الرقیق' (میں نے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کر دی ہے)۔ اسی طرح فرمایا ہے:

لیس فیما دون خمسة اوسق من التمر صدقة، ولیس فیما دون خمس اواق من الورق صدقة، ولیس فیما دون خمس ذود من الابل صدقة. (الموطا، رقم ۵۷۸)

''۵ وسق سے کم کھجور میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، ۵ اوقیہ سے کم چاندی میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے اور ۵ سے کم اونٹوں میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔'''' (۱۳۰-۱۳۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ واضح طور پر یہ بتا رہے ہیں کہ یہ نصاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا رسول ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ عرب کی ریاست کا فرماں روا ہونے کی حیثیت سے مقرر فرمایا تھا، چنانچہ اگر ریاست محسوس کرے تو وہ اس میں تبدیلی کر سکتی ہے۔

خلافت راشدہ میں پیداوار کی زکوٰۃ

سوال: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بہت سے محکمے وجود میں آ گئے تھے تو کیا انھوں نے کرایے اور معالجوں کی فیسوں پر پیداوار کی زکوٰۃ عائد کی تھی، جیسا کہ غامدی صاحب کے خیال میں یہ عائد ہونی چاہیے؟ (اے کے فریدی)

جواب: اس زمانے میں تنخواہ پر پیداوار کی زکوٰۃ عائد نہیں کی جاتی تھی۔ اگرچہ بعض چیزوں پر زکوٰۃ عائد کرنا اور بعض کو اس سے مستثنیٰ قرار دینا امیر ریاست کا کام ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے تو پھر یہ لازم نہیں رہتا کہ جو کچھ وہاں موجود نہیں تھا، وہ یہاں بھی موجود نہ ہو۔ وقت اور زمانے کی تبدیلی سے حالات بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نئے حالات میں شریعت کے اطلاقات کو از سر نو متعین کیا جائے۔ شریعت کے اسی اطلاق کی تعیین کے حوالے سے استاذ محترم غامدی صاحب فرماتے ہیں:

"...جو کچھ صنعتیں اس زمانے میں وجود میں لاتیں اور اہل فن اپنے فن کے ذریعے سے پیدا کرتے اور جو کچھ کرایے، فیس اور معاوضہ خدمات کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، وہ بھی اگر مناط حکم کی رعایت ملحوظ رہے تو پیداوار ہی ہے۔ اس وجہ سے اس کا الحاق اموال تجارت کے بجائے مزروعات سے ہونا چاہیے اور اس معاملے میں وہی ضابطہ اختیار کرنا چاہیے جو شریعت نے زمین کی پیداوار کے لیے متعین کیا ہے۔

...اس اصول کے مطابق کرایے کے مکان، جائدادیں اور دوسری اشیا اگر کرایے پر اٹھی ہوں تو مزروعات کی اور اگر نہ اٹھی ہوں تو ان پر مال کی زکوٰۃ عائد کرنی چاہیے۔" (قانون عبادات ۱۳۱-۱۳۲)

یہ درج بالا نقطۂ نظر غامدی صاحب کا اجتہاد ہے جسے وہ اپنے استدلال کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، ان کے نزدیک یہ صحیح ہے، لیکن اس میں غلطی کا امکان موجود ہے۔

طلاق کی نیت کے بغیر طلاق کے الفاظ بولنا

سوال: میں نے اپنی بیوی کے ساتھ جھگڑے کے دو مختلف موقعوں میں سے ہر موقع پر محض اسے دبانے اور چپ کرانے کے لیے دو بار طلاق طلاق کے الفاظ بولے ہیں جس کے نتیجے میں اس وقت وہ جھگڑا ختم ہو

گیا۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں، جبکہ میں نے طلاق دینے کی نیت سے طلاق کے الفاظ بولے ہی نہیں تھے، میرے ان الفاظ سے طلاق واقع ہوگئی تھی؟ (عبدالستار، جاپان)

جواب: آپ نے جو بات لکھی ہے، اگر وہ واقعتاً ایسے ہی ہے تو پھر ہمارے نزدیک ان الفاظ سے کوئی ایک طلاق بھی واقع نہیں ہوئی، البتہ ان الفاظ کا اس طرح بولنا شدید غلطی ہے۔ یہی الفاظ اگر آپ قاضی کی عدالت میں کھڑے ہو کر بولیں گے تو وہ آپ سے نیت پوچھے بغیر طلاق واقع کر دے گا، کیونکہ ان الفاظ کا ایک سنجیدہ مطلب اور طے شدہ مقصد ہے۔ اس مقصد کے بغیر انھیں بولنا ہرگز درست نہیں۔

بہرحال، ہمارے خیال میں آپ کے طلاق کی نیت کے بغیر یہ الفاظ بولنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، البتہ آپ کو اپنی اس غلطی پر سچے دل سے توبہ واستغفار کرنی چاہیے۔ طلاق کے لفظ کی، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، ایک قانونی حیثیت ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنا کسی صورت بھی درست نہیں، لہٰذا آپ یہ عہد کریں کہ آپ آیندہ ان الفاظ کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔

وقوع قیامت

سوال: بعض علما کا یہ خیال ہے کہ مرنے کے فوراً بعد ہر انسان کے اعمال کا حساب کتاب ہو جاتا ہے اور وہ جنت یا دوزخ جس کا بھی مستحق ہو، اس میں چلا جاتا ہے۔ یہی وہ قیامت ہے جو انسان پر آنی ہے۔ اس فوراً حساب کتاب کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ 'سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ' ہے، لہٰذا وہ قیامت کے حساب کتاب میں دیر نہیں کرتا، لیکن علما ہی کے ایک دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ حساب کتاب قیامت ہی کے دن ہوگا، وہاں از اول تا آخر تمام انبیا کو اور ان کی امتوں کو اکٹھا کیا جائے گا، پھر ان کے اعمال کا حساب کتاب ہوگا اور پھر اس کے بعد لوگ اپنے اچھے یا برے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔

آپ یہ بتائیے کہ قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں ان دونوں میں سے کون سی راے صحیح ہے؟

(غلام یٰسین)

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ 'سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ' کا مفہوم اگر ہم اپنے معیارات اور اپنے ذہنی پیمانوں سے طے کریں گے تو یہ صحیح نہیں ہوگا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّھُمْ یَرَوْنَہٗ بَعِیْدًا، وَّ نَرٰہُ قَرِیْبًا، یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُھْلِ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ. (المعارج ۷۰:۶-۹)

''وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اس کو نہایت قریب دیکھ رہے ہیں جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کی مانند ہو جائے گا اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی مانند۔''

آج سے تقریباً سوا چودہ سو سال پہلے مشرکین مکہ نے قیامت کے بارے میں جب یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ تو بہت دور ہے تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ تم اسے بہت دور سمجھ رہے ہو اور ہم اسے نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔

آج سوا چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود، وہ قیامت ابھی تک نہیں آئی جس میں آسمان تیل کی تلچھٹ کی مانند اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کی مانند ہو جائیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نزول قرآن کے زمانے ہی میں اس کو قریب دیکھ رہا تھا۔ کیا قیامت کے قریب ہونے کے بارے میں خدا کی بات غلط ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ خدا ہی کی بات صحیح ہے، البتہ اس وقت ہمارا فہم اس کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے۔

دنیا میں ایک لمبی زندگی گزارنے کے بعد جب لوگ قیامت کے دن اٹھیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دنیا میں کتنا عرصہ رہے تو وہ کہیں گے کہ 'یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ' (ایک دن یا اس کا کچھ حصہ)، ظاہر ہے کہ جس دن انسان کو اپنی ساٹھ ستر سالہ زندگی ایک دن یا اس کا کچھ حصہ محسوس ہو گی تو امید ہے کہ اس دن اسے یہ بھی محسوس ہو جائے گا کہ قیامت بہت ہی قریب تھی اور یہ بہت جلد آ گئی ہے۔

چنانچہ ہمیں خدا کی بات کو اپنے معیارات اور اپنے پیمانوں کے مطابق نہیں لینا چاہیے۔

اعمال انسانی کے حساب کتاب کے بارے میں جو دو مختلف نقطہ ہائے نظر آپ نے پیش کیے ہیں، ان میں سے دوسرا نقطۂ نظر ہی صحیح ہے۔ آیات قرآن اسی کی تصدیق کرتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ، فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ، وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ، وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ، وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ، لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ، لِیَوْمِ الْفَصْلِ. (المرسلٰت ۷۷:۷-۱۳)

''بے شک، جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، وہ شدنی ہے۔ پس، جبکہ ستارے بے نشان کر دیے جائیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے اور رسولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا، کس دن کے لیے وہ ٹالے گئے ہیں، فیصلے کے دن کے لیے۔''

ان آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ قیامت اس وقت آنی ہے جب ستاروں نے اپنی روشنی کھو دینی ہے، آسمان

نے پھٹ جانا ہے، پہاڑوں نے ریزہ ریزہ ہونا ہے، جب یہ سب کچھ ہو جائے گا تب خدا کے سامنے رسولوں کے حاضر ہونے کا وقت آ جائے گا، ان کی یہ حاضری، فیصلے کے اس خاص دن ہی کے لیے موخر کی گئی ہے:

قَالَ يٰٓاِبۡلِيۡسُ مَا مَنَعَكَ اَنۡ تَسۡجُدَ لِمَا خَلَقۡتُ بِيَدَىَّ، اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ، قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ، قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ وَّاِنَّ عَلَيۡكَ لَعۡنَتِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ، اِلٰى يَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ. (ص۳۸: ۷۵-۸۱)

''اے ابلیس، تجھے اس (وجود) کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے؟ یہ تو نے تکبر کیا ہے یا تو کوئی برتر ہستی ہے، اس نے کہا: میں اس سے برتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا، حکم ہوا: تو یہاں سے نکل جا، کیونکہ تو راندۂ درگاہ ہوا اور تجھ پر میری لعنت ہے، جزا کے دن تک، اس نے کہا: اے میرے رب، مجھے مہلت دے، اس دن تک کے لیے جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے۔ ارشاد ہوا: تجھ کو مہلت دی گئی، وقت معین تک کے لیے۔''

ان آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اٹھائے جانے کا ایک خاص دن ہے۔ چنانچہ شیطان نے اسی خاص دن تک کے لیے خدا سے مہلت مانگی تھی۔

ارشاد باری ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ وَالۡاَرۡضُ جَمِيۡعًا قَبۡضَتُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطۡوِيّٰتٌۢ بِيَمِيۡنِهٖ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ. وَنُفِخَ فِى الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ، ثُمَّ نُفِخَ فِيۡهِ اُخۡرٰى فَاِذَا هُمۡ قِيَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ. وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ وَجِاىۡٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ. وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِمَا يَفۡعَلُوۡنَ. وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا... وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَنَّةِ زُمَرًا.

(الزمر ۳۹: ۶۷-۷۳)

''اور لوگوں نے خدا کی صحیح قدر نہیں جانی، قیامت کے دن زمین ساری کی ساری اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے، ان چیزوں سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں اور صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ چاہے، پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو دفعۃً وہ کھڑے ہو کر تاکنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی

اور رجسٹر رکھا جائے گا اور انبیا اور گواہ حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں کے مابین انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا اور ہر جان کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا، وہ گروہ در گروہ جہنم کی طرف ہانک کر لے جائے جائیں گے... اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے، وہ گروہ در گروہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔''

یہ آیات بھی بہت صراحت کے ساتھ بتا رہی ہیں کہ لوگوں کے اعمال کا حساب کتاب ان کے مرنے کے ساتھ ہی نہیں ہو جائے گا، بلکہ اس سے پہلے کئی واقعات ہوں گے۔ صور میں دو دفعہ پھونکا جائے گا، سب لوگ اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے، خدا زمین کو اپنی مٹھی میں پکڑ لے گا، آسمان کی بساط کو اپنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا اور اپنی بزرگی بیان کرے گا۔ پھر خدا ہی جانتا ہے کہ کتنے مراحل اور گزریں گے اور پھر زمین خدا کے نور سے چمک اٹھے گی۔ تب رجسٹر رکھا جائے گا، انبیا اور گواہ حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں کے مابین انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور پھر اس کے بعد گناہ گار جہنم کی طرف اور نیکوکار جنت کی طرف لے جائے جائیں گے:

اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ. لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا، اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا، وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ. فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ. فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِىْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ.

(المؤمنون ۲۳: ۹۹-۱۰۳)

''جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوگی تو وہ کہے گا: اے میرے رب، مجھے پھر واپس بھیج کہ جو کچھ میں دنیا میں چھوڑ آیا ہوں، اس میں کچھ نیکی کما لوں، ہرگز نہیں یہ محض ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور اب ان سب مرنے والوں کے آگے اس دن تک کے لیے ایک پردہ ہوگا جس دن یہ اٹھائے جائیں گے۔ چنانچہ جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن آپس کا نسب کام نہ آئے گا اور نہ وہ ایک دوسرے سے مدد کے طالب ہوں گے۔ پس جن کے پلے بھاری ہوں گے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلے ہلکے ہوں گے تو وہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔''

ان آیات میں بہت صراحت سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ موت کے بعد قیامت کا دن آنے تک لوگ برزخ میں رہیں گے، پھر صور پھونکا جائے گا، پھر اعمال کا وزن ہوگا اور اس کے بعد لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق جنت یا جہنم میں جائیں گے۔

اس مضمون کی بے شمار آیات قرآن میں موجود ہیں، جن کی کوئی اور توجیہ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ان کے خلاف ہر تصور باطل ہے۔

نبی پر ایمان لانا

سوال: سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۲ اور سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۶۹، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان، عیسائی، یہودی اور صابی جو بھی اللہ پر ایمان رکھے گا، یوم حساب سے ڈرے گا اور نیک کام کرے گا، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہو گا اور وہ ایسی زندگی میں ہو گا جس میں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ کوئی غم، ان آیات سے کیا مراد ہے؟ کیا یہود و نصاریٰ اور صابئین یا کسی بھی غیر مسلم کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے؟ (غلام یٰسین)

جواب: یہ دونوں آیات دراصل، ایک ہی بات بیان کر رہی ہیں اور وہ یہ کہ انسان کے لیے بخشش کا اصل معیار اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے۔ اگر کوئی شخص ان پر پورا اترتا ہے اور اس نے کوئی ایسا جرم بھی نہیں کیا جو اس کے ایمان کے لازمی تقاضے کے خلاف ہو تو پھر اس کی بخشش ہو جائے گی۔

استاذ محترم غامدی صاحب اپنی تفسیر ''البیان'' میں سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۶۱ اور ۶۲ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرہ ۲: ۶۱-۶۲)

''(وہ یہی کرتے رہے) اور اُن پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کا غضب کما لائے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے تھے اور اُس کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اُنھوں نے نافرمانی کی اور وہ اللہ کی ٹھیرائی ہوئی کسی حد پر نہ رہتے تھے۔

(اِس سے واضح ہے کہ جزا و سزا کا قانون بالکل بے لاگ ہے۔ لہٰذا) وہ لوگ جو (نبی امی پر) ایمان لائے ہیں اور جو (ان سے پہلے) یہودی ہوئے اور جو نصاریٰ اور صابی کہلاتے ہیں، اُن میں سے جن لوگوں نے بھی اللہ کو مانا

ہے اور قیامت کے دن کو مانا ہے اور نیک عمل کیے ہیں، ان کا صلہ (اُن کے) پروردگار کے پاس ہے اور (اُس کے حضور میں) اُن کے لیے کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ کوئی غم (وہاں) کھائیں گے۔''

ان آیات کی شرح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

''...یہ ذلت اور مسکنت اس لیے ان (یہود) پر تھوپی گئی کہ انھوں نے پے در پے جرائم کا ارتکاب کیا اور اپنی سرکشی اور تعدی کے باعث ہر حد توڑ دی، یہاں تک کہ اللہ کے نبیوں تک کو قتل کر ڈالا۔ یہوداہ میں ان کے بادشاہ یوآس کے حکم سے زکریا علیہ السلام کو عین ہیکل میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگ سار کیا گیا۔ انھی کے فرماں روا ہیرودیس کے حکم سے یحییٰ علیہ السلام کا سر ایک تھال میں رکھ کر اس کی معشوقہ کی نذر کر دیا گیا۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کو بھی انھوں نے اپنے زعم کے مطابق سولی پر چڑھا دیا۔...اس بدترین جرم کا ارتکاب انھوں نے 'بغیر الحق' یعنی بغیر کسی وجہ جواز کے کیا۔ قتل نفس، پھر انبیا علیہم السلام کا قتل اور وہ بھی بغیر کسی وجہ جواز کے، گویا اس جرم کی تمام سنگینیاں انھوں نے ایک ہی جگہ جمع کر دیں۔ قرآن نے واضح کر دیا کہ ان کے انبیا کی اولاد ہونے کے باعث اللہ تعالیٰ نے ان جرائم کے بعد انھیں چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ان کی پاداش میں انھیں پکڑا اور اسی دنیا میں ان کے جرائم کی سزا انھیں دی۔ ...قرآن نے نہایت غیر مبہم طریقے پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی شخص کو فلاح محض اس بنیاد پر حاصل نہ ہوگی کہ وہ یہود و نصاریٰ میں سے ہے یا مسلمانوں کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا صابی ہے، بلکہ اس بنیاد پر حاصل ہوگی کہ وہ اللہ کو اور قیامت کے دن کو فی الواقع مانتا رہا ہے اور اس نے نیک عمل کیے ہیں۔ ہر مذہب کے لوگوں کو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اس سے کوئی بھی مستثنیٰ نہ ہوگا۔ یہود کا یہ زعم محض زعم باطل ہے کہ وہ یہودی ہونے ہی کو نجات کی سند سمجھ رہے ہیں۔ یہ بات ہوتی تو اللہ دنیا میں بھی ان کے جرائم پر ان کا مواخذہ نہ کرتا، لہٰذا وہ ہوں یا مسلمان یا کسی اور مذہب و ملت کے پیرو، ان میں سے کوئی بھی محض پیغمبروں کو ماننے والے کسی خاص گروہ میں شامل ہو جانے سے جنت کا مستحق نہیں ہو جاتا، بلکہ اللہ اور آخرت پر حقیقی ایمان اور عمل صالح ہی اس کے لیے نجات کا باعث بنتا ہے۔...(لیکن) اللہ تعالیٰ کی طرف سے (نجات کی) یہ بشارت، ظاہر ہے کہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ آدمی نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو جو ایمان اور عمل صالح کے باوجود اسے جہنم کا مستحق بنا دیتا ہے، مثلاً: کسی بے گناہ کو قتل کر دینا یا جانتے بوجھتے اللہ کے کسی سچے پیغمبر کو جھٹلا دینا۔''
